آزمائشِ مُحبت

نایاب جیلانی

نایاب جیلانی

آزمائش محبت

ڈھولک کی تھاپ دور تک سنائی دیتی تھی۔ رات کی تاریکی میں ڈھولک کی تھاپ مجیروں سے مشابہ تھی۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے چاندی کے تھال میں سکے گر رہے ہوں۔ ایسا شور جو سماعتوں کو بھلا لگنے کے بجائے گراں گزر رہا تھا۔

وہ کانوں پہ ہاتھ رکھتی ریلنگ پہ جھکی تو نیچے دور تک تاریکی دکھائی دی تھی۔ آسمان بھی روشنی سے خالی تھا۔ جانے ستارے کہاں تھے؟ اور اکلوتا چاند؟ اسے پورا آسمان خالی دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اس کے بائیں پہلو میں خاموش دل۔ جو دھڑک تو رہا تھا.... لیکن سکون سے خالی تھا اور شاید امنگوں سے بھی....

اس نے اپنی گوری کلائیوں میں سجی چوڑیوں کو دیکھا۔ ہری اور لال شیشے کی چوڑیاں.... جن میں کھنک نہیں تھی اور اپنے وجود پہ لپٹے پیلے لباس کو دیکھا۔ اس کا دل اس کا وجود.... سب کچھ خالی پن میں کھویا ہوا تھا۔

کچھ دیر پہلے وہ اس کے پاس آئی تھیں۔ اسے ڈھونڈتی ہوئی۔ ان کے چہرے پہ تفکرات تھے۔ پریشانی تھی۔ وہ نکاح سے پہلے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ دل میں ہزاروں خدشے لیے اسے ڈھونڈتی سب سے

مکمل ناول

اوپری چھت پہ۔ آئیں تو وہ انہیں سر نیہواڑے ریلنگ کے پاس لٹی پٹی سی تنکیں دکھائی دے گئی تھی۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

وہ اتنی آزردہ، رنجیدہ اور غم زدہ کیوں تھی۔ سب کچھ تو حسب منشا تھا، پھر بھی؟

اور جب انہوں نے یہی بے ضرر سا سوال اس کے سامنے رکھا تو وہ اندر تک کاٹ دینے والی نگاہ سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اس نگاہ میں کیا کچھ نہیں تھا۔ ان سے سر ہی نہ اٹھایا گیا اور جب انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے لے جانا چاہا تو اس کے خاموش لبوں نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی تھی۔ اس کی سرخ انگارہ آنکھوں سے قطرہ قطرہ سیل رواں تھا۔ ان کے اندر جیسے خزاں اترنے لگی۔

ان لفظوں میں کیا تھا؟ آخر کیا تھا؟ انہوں نے اپنا دل بمشکل سنبھالا اور ریلنگ کا سہارا لیا۔ وہ انہیں کٹہرے میں کھڑا نہیں کر رہی تھی۔ وہ ان کے سامنے انکار بھی نہیں کر رہی تھی۔ وہ تو صرف انہیں ”احساس“ دلا رہی تھی..... وہ احساس جو ان کے اندر سے کہیں کھو گیا تھا۔ ان کی بیٹی اس ”احساس“ کا انہیں احساس دلا رہی تھی اور اس کے لفظ؟ ان کا رواں رواں کان بن گیا تھا۔

”اگر آپ کو ان سے محبت ہے تو؟ اگر آپ کو اپنی بیٹی سے محبت ہے تو..... اگر محبت ہے تو؟ یوں مت کریں، ایسا مت کریں۔“

چار لفظوں کے اس چابک کو اگر جملہ کہتے تھے تو یہ جملہ بڑا سخت قسم کا جملہ تھا۔ ان کی ہستی کو ہلا دینے والا۔ ان کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لینے والا..... وہ جب الٹے قدموں جا رہی تھیں تو ان کے قدموں تلے انگارے بچھے تھے اور زمین پہ جیسے بھونچال تھا۔ ان کا ایک قدم کہیں جاتا اور دوسرا کہیں.....

✲ ✲ ✲

مشک فام سی رات میں گلابوں اور گیندے کی کلیوں کی باس تھی۔ کچھ نمکین سا، ذائقہ بھی..... ہاں آنسوؤں کی نمی کا احساس یا پھر اسے ہی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اور پردے بھی برابر کر لیے تھے۔ اس نے قد آدم آئینے کی طرف توجہ کر لی تھی۔ آئینے کے اندر اس کا اپنا عکس تھا۔ ایک مکمل اور بھرپور سراپا..... وہ خود کو دیکھتا چونک گیا تھا۔ اسے اپنا آپ بہت خالی اور ادھورا سا لگا۔

کچھ دیر بعد نکاح کی رسم تھی۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنے لگا۔ سب کچھ حسب منشا، حسب رضا تھا، پھر بھی یہ ادھورا پن اور کاٹ کھاتی تنہائی؟ یہ اس کے اندر کی کیفیات تھیں، ورنہ باہر تو ایک ہنگامہ تھا اور اس ”ہنگامے“ کے پیچھے ایک اور بڑا ہنگامہ.....

اور ابھی وہ اس کے پاس آئی تھیں۔ اسے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتی ہوئی اور اسے دیکھ کر ان کا ”جی“ نہیں بھر رہا تھا۔ وہ کتنا پیارا تھا، کتنا بھرپور تھا۔ کسی بھی لڑکی کا خواب..... انہیں اس سے بہت محبت تھی۔ بے انتہا، بس اسے جنم نہیں دیا تھا۔ ممتا تو سارے زمانے کی نچھاور کی تھی اور آج وہ جو ان کی بیٹی تھی۔ اسی محبت کا حساب مانگنے کھڑی تھی۔

وہ شاہ زیب کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔ مشکل سے ہی سہی۔ دل کو مار کر ہی سہی۔ جذبوں کو مار کر ہی سہی۔

”زیب! وہ یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ کہتی ہے۔ اگر مجھے تم سے محبت ہے تو میں ایسا مت کروں۔ اس شادی کو روک دوں..... اور میں نے خود کو ہزار مرتبہ ٹٹول کر سوچا اور فیصلہ کیا ہے کہ میں اس کی بات مان لوں..... کیونکہ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ اس لیے میں یہ نہیں کروں گی۔“

وہ اسے پتھر بنا کر الٹے قدموں واپس جا رہی تھیں..... یوں کہ ان کے قدم لرزیدہ تھے۔ شکستہ تھے اور شاہ زیب بھی جیسے پتھر میں ڈھل کر ان کے لفظوں کے اثر میں کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور آج دوپہر کملائی ہوئی تھی۔ خشک' بے رنگ اور ویران سی.....

اس نے ایک تکان بھری نگاہ دور تک پھیلی تارکول پہ ڈالی تھی۔ ابھی تک اس کی مطلوبہ وین آنے کے کوئی آثار نہیں لگتے تھے۔ جانے آج وین والا کہاں مر گیا تھا؟

اپنی فائلز' فولڈر' اسکیچز اور پورٹ فولیو کے بنڈل بینچ پہ رکھ کر اس نے موبائل نکالا' تاکہ ڈیڈی کو دیر ہو جانے کی صورت میں اطلاع کر سکے۔ ورنہ ڈیڈی سے کچھ بعید نہیں تھا کہ گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔

ثانی نے پسینے سے تربتر اپنا لال ٹماٹر چہرہ ٹشو سے رگڑا اور موبائل پرس سے نکال کر ڈیڈی کا نمبر ڈائل کرنے کے لیے بٹن پریس کیا تو موبائل کی بیٹری ہی ڈیڈ تھی۔ ایک نئی مصیبت..... اب کرے تو کیا کرے؟

وہ شدید ڈپریس ہو رہی تھی۔ ان حالات میں اکثر اسے اپنے کسی بھائی کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اس معاملے میں چاچو کتنے خوش نصیب تھے۔ چاچو کے چار چار بیٹے تھے۔ چھوٹے بڑے سب فرض شناس..... اپنی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے والے اور ایک ثانی تھی۔ تنہا' اکیلی اور سے ڈھیروں ذمہ داریاں تھیں۔ جب سے ڈیڈی شوگر اور دل کے عارضے میں مبتلا ہوئے تھے۔ ثانی کا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ باہر کی ذمہ داریوں کو بھی نپٹائیں۔ وہ حتی المقدور کوشش کرتی تھی باہر کے کام بھی خود سرانجام دے آیا کرے۔ اور اس وقت جانے کیسے کیسے احساس حملہ آور ہو رہے تھے' جنہیں ذہن سے جھٹکتے ہوئے وہ چاچے فوجی کی وین کا مزید انتظار کرنے کے بجائے تمام ہمتیں مجتمع کرتی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ اسے اب پیدل ہی گھر جانا تھا اور جب وہ ساڑھے تین میل پیدل چلنے کے بعد ہانپنے لگی اور سر چکرانے لگا تو ایسے ہی سڑک پہ رواں دواں گاڑیوں کے اژدھام میں اسے ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ ثانی کو پہلے پہل تو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا تھا۔ کیونکہ وہ عموماً" اس وقت اپنے دفتر میں ہوتا تھا۔

اس نے لال ہوتی آنکھوں کو مسل مسل کر دیکھا۔ وہ ہو بہو وہی تھا۔ سفید براق ایوی ایشن کی یونی فارم شرٹ اوپر ایوی ایشن کے بیج..... بلیک پینٹ اور اس کا انتہائی عالی شان سراپا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دھوپ نے دھنک اوڑھ لی ہو۔ وہ ایسا ہی تو تھا۔ لاکھوں میں ممتاز نظر آنے والا۔ دل نشین' وجیہہ..... روح اور دل میں اتر جانے والا۔

اور اس وقت اس بیکراں ہجوم میں وہ اپنی ایک الگ "شان" کے ساتھ بائیک پہ موجود تھا اور کئی نگاہوں کا اکلوتا مرکز بھی..... ثانی نے رشک کے عالم میں کئی لوگوں کو مڑ مڑ کر اسے دیکھتے دیکھا تھا۔

اس تیز دھوپ میں اتنا خوب صورت چہرہ اچانک دکھائی دیا تو ایسے لگ رہا تھا جیسے دن بھر کی تمام تکان کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

اور ایسے ہی نگاہ..... ہاں اس وجیہہ چہرے پہ جمی

ہوئی نگاہ ذرا دیر کو پیچھے کی طرف ہٹی تو ثانی کی آنکھوں میں اذیت پھیلتی چلی گئی تھی۔

وہ کالج یونی فارم میں.... اس کے پیچھے نزاکت سے بیٹھی ہوئی تھی۔ گود میں فائل رکھے۔ یقیناً "پیپر دے کر آرہی تھی اور وہ اسے امتحانی مرکز سے واپس گھر چھوڑنے جارہا تھا۔ واہ.... مولا! کیسے کیسے نصیب پائے ہیں لوگوں نے.... اس کے اندر نہ چاہتے ہوئے بھی ایک حسد کی چنگاری بھڑکی تھی۔ جانے کیوں ثانی کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو بھر گئے تھے۔ جسے جھپک جھپک کر اندر کرتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ لمحوں میں اس کی نگاہ سے اوجھل ہوگیا تھا۔

چونکہ اشارہ کھل گیا تھا اور ٹریفک کے بے ہنگم شور' ہارن کی آوازوں پہ ایک بھونچال آگیا تھا۔ وہ دل فریب چہرہ نگاہوں سے اوجھل ہوا تو ذرا دیر پہلے پھیلی ہوئی دھنک بھی جانے کس طرف ڈھلک گئی تھی۔

اس وقت وہی بے زار کن ماحول اور کملائی ہوئی دوپہر کی بے زاریت ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ ثانی نے ایک دکھ بھرا سانس فضا کے سپرد کیا اور سر جھکائے چلنے لگی۔ اس حال میں کہ شہر دل گھٹی گھٹی سسکیوں سے گونج رہا تھا اور اندر ایک حشر برپا تھا۔ یہ اس کی کج ادائی تھی' بے وفائی تھی یا بے اعتنائی تھی۔ جو ازل سے وہ سہتی آرہی تھی۔ اپنے دل پہ خاموشی سے 'بڑی ہی خاموشی سے جھیلتی آرہی تھی۔ کیونکہ یہ اس کے اندر ازل سے پلتے عشق کا کمال تھا اور اس کے عشق سے قطع نظر وہ اس سے محبت کا کہیں بھی دعوے دار نہ تھا۔

ثانی کو اپنے اس یک طرفہ عشق پہ بڑا ہی ترس آیا۔ یہ عشق باکمال ایسا ہی تھا جس پہ ترس کھایا جاتا۔

☆ ☆ ☆
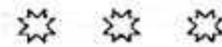
گھر پہنچتے پہنچتے دھوپ ڈھل ہی گئی تھی۔

وہ پسینے سے نچڑتے لال چہرے کے ساتھ جیسے ہی اپنی گلی میں داخل ہوئی تو لمحہ بھر کے لیے اس کا دل سکڑ سا گیا تھا۔ تاحد نگاہ گلی خالی تھی۔ بالکل سنسان اور ویران.... کہیں دور نزدیک کیپٹن خضر حیات کی لاٹھی کی ٹک ٹک سنائی نہ دیتی تھی۔ جس کا مطلب تھا۔ ڈیڈی اس کے انتظار میں گلی کے نکڑ پہ کہیں نہیں کھڑے تھے۔ کیا وہ اس کا انتظار کرتے کرتے تھک کر گھر چلے گئے تھے؟ یا آج وہ آئے ہی نہیں تھے؟ بھلا یہ ممکن تھا کیا۔

پھر اچانک ہی اسے خیال آیا۔ "ڈیڈی کی طبیعت نہ خراب ہو؟" اس خیال کے ساتھ ہی اس کے انتہائی سفید دودھ سے گلابی ملائم چہرے پہ وحشت پھیلی تھی۔

چند فرلانگ کی گلی پل صراط کی مانند تھی۔ جسے اس نے کس مشقت سے طے کیا تھا۔ اس کا دل جانتا تھا۔ سامنے ہی اس کا گھر تھا۔ اپنا گھر' آٹھ دس مرلے پہ مشتمل۔ ایک زمانے میں خوب صورت سا بڑی بڑی کھڑکیوں والا بنگلہ تھا۔ جس کے چاروں اور برآمدے تھے۔

اس کے ڈیڈی کیپٹن ریٹائرڈ خضر حیات نے بڑی محبت اور چاہ سے بنوایا تھا۔ بعد ازاں امی کی وفات کے بعد ان کی دلچسپی گھر سے کم ہوتے ہوئے محض ثانی تک محدود رہ گئی تھی۔ اب یہ سبز بیلوں والا بنگلہ اتنا قابل توجہ نہیں رہا تھا۔ عرصہ ہوا پینٹ کی قبا پھٹ گئی تھی۔ بارشوں اور طوفانوں کے نشان جگہ جگہ انمٹ تھے۔ برآمدے اور صحن کی چپس کا حال بھی ماٹھا تھا۔ گیٹ کے سامنے چھوٹی سی راہ داری تھی اور ایک طرف مختصر سا صحن.... آگے برآمدہ تھا اور لائن میں تین کمرے۔ برآمدے میں ایک طرف باتھ روم تھا تو دوسری طرف باورچی خانہ.... تینوں کمروں کے آگے جالی دار دروازے لگے تھے۔ جو اس وقت بند تھے۔ برآمدے کے بالکل ساتھ سیڑھیاں تھیں جو اوپر کی طرف دوسری منزل پہ جاتی تھیں۔ اوپر چاچو کی فیملی آباد تھی۔

برآمدے میں کین کی کرسیاں رکھی تھیں۔ ڈیڈی یہیں بیٹھ کے ناشتا کرتے تھے۔ لنچ البتہ کمرے میں ہوتا تھا۔ پھر شام کی چائے اور ڈنر یا تو برآمدے میں یا صحن میں.... برسوں سے یہی معمول چلتا آرہا تھا۔ برآمدے میں کین کی کرسی پہ بیٹھنا ڈیڈی کو بہت پسند تھا۔ وہ

یہاں بیٹھ کر اخبار پڑھتے تھے۔ یا ثانی سے باتیں کرتے تھے۔ یا پھر اوپر والوں کو جلی کٹی سناتے۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔

اس نے تیزی سے بیل دی۔ ایک دفعہ' دو دفعہ' تین دفعہ۔۔۔

اوپر والوں نے کبھی گیٹ کھولنے کا فریضہ سرانجام نہیں دیا تھا۔ اوپر سے کھڑکی کھول کر جھانک لیتے۔ ان کا کوئی مہمان ہوتا یا یہ خود۔۔۔ اوپر سے کوئی بھی نیچے آنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا۔

معاً" دروازہ کھل ہی گیا۔ آخر کسی کو ترس آ ہی گیا تھا۔ دروازہ کھولنے والا جس تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا آیا تھا' ایسے ہی واپس چلا گیا اور ثانی بس اس کی پشت دیکھتی رہ گئی تھی۔

اس کے لب کھلے اور پھر بند ہو گئے تھے۔ منہ میں آیا سلام وہیں کہیں اندر ہی گھٹ گیا تھا۔ پھر اس نے جالی دار کچن کے دروازے میں سے اندر جھانکا تھا۔ کچن بھاں بھاں کر رہا تھا۔ وہیں سلیب پہ اسے مٹھائی کا ڈبا دکھائی دیا۔ یہ ڈبا کہاں سے آیا تھا؟ وہ سوچتی ہوئی ڈیڈی۔۔۔ ڈیڈی پکارتی اندر آئی تو ڈیڈی اپنے کمرے میں بستر پہ بیٹھے دکھائی دیے تھے۔ گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے یعنی وہ اپنے دھیان میں اتنے گم تھے کہ انہیں گھنٹیوں کی آواز نے بھی نہیں چونکایا تھا؟ ثانی کا دل بری طرح سے ہراساں ہوا۔

وہ تیزی سے ان کے قریب آ گئی تھی۔ پھر اس نے ان کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر آگے کی طرف جھانکا۔ وہ کچھ کاغذات نکال کر بیٹھے تھے۔ اسے دیکھ کر بری طرح سے چونک گئے۔

"اتنی دیر لگا دی؟ وقت دیکھا ہے تم نے؟ میری جان نکال کے رکھ دی۔" وہ غصے میں اچانک بولتے چلے گئے تھے اور ساتھ ساتھ کاغذات بھی سمیٹ رہے تھے۔ بڑے غیر محسوس طریقے سے پھر بھی ثانی جان ہی گئی تھی۔ یہ پرانی فائل کیا تھی اور اس کے اندر کون سے کاغذ موجود تھے۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"تب ہی آپ میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ اتنی دھوپ میں' آنکھیں لگا کر۔" وہ خفگی سے جوابی کارروائی کرتے ہوئے تھی۔ ڈیڈی نے آنکھیں میچ کر اسے دیکھا اور اس کے سرخ بھبھوکا چہرے کو بھی۔۔۔

"اٹھارہ چکر لگا کے آیا تھا۔ اب تو ٹانگوں میں دم نہیں رہا۔ اس الو کو فون کرتا رہا۔ اس کی وین کا ٹائر بلاسٹ ہو گیا تھا اور تمہارا نمبر بند۔۔۔ پریشانی نے بلڈ پریشر ہائی کر دیا تھا۔" وہ بھی ناراضی سے بتا رہے تھے اور اس ناراضی کی تان کہاں آ کر ٹوٹ جاتی تھی؟ ثانی نے گہرا سانس بھرا۔

"میں کہتا ہوں۔ بھاڑ میں جھونکو اس آرٹ اکیڈمی کو۔۔۔ میں تمہاری نوکری کے پہلے بھی حق میں نہیں تھا۔ اب بس بہت ہو گیا۔" انہوں نے دوٹوک کہا تھا۔ ثانی نے خاموشی ہی غنیمت جانی تھی۔ اب کیا تکرار کرتی؟ وہ جانتے تو تھے۔ ان کی پنشن میں گھر چلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اوپر سے ان کی دوائیوں کا خرچا' مہمان داری؟ وہ گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

"آپ نے کچھ کھایا ہے؟" وہ اپنی چیزیں اٹھا کر ایک طرف رکھتی اب بی پی چیک کرنے کا آلہ لے آئی تھی۔ پہلے اس نے ان کا بی پی چیک کرنا تھا اور پھر شوگر۔۔۔ اس کے بعد وہ ان کے لیے کھانا لگاتی۔ پھر دوا کھلاتی اور کہیں بعد میں اسے اپنا خیال آتا تھا۔ یہ ہی تو اس کی محبت تھی۔ بے انتہا' بے اندازہ۔۔۔ وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگے تھے' لیکن زبان پہ گویا انگارے دھرے تھے۔

"ہاں کھایا ہے۔ بھوسا' غصہ' تلخیاں۔۔۔" وہ منہ بنا کر بولے تھے۔ ان کا موڈ آف لگتا تھا۔ جانے کیوں؟ اس آف موڈ میں انہوں نے بلڈ پریشر چیک کروایا تھا۔ خدا کا شکر تھا۔ بی پی اب نارمل ہی تھا۔

"فریج میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ ان تمام آئٹمز کے علاوہ۔۔۔" ثانی تحمل سے گویا ہوئی تھی۔

"میں نہیں کھاتا۔۔۔ وہ فریج کی سڑی ہوئی چیزیں۔۔۔" انہوں نے بی پی آپریٹس اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

"اب میں شوگر چیک نہیں کرواؤں گا۔" ساتھ وارننگ بھی دی تھی۔ وہ انہیں خواہ مخواہ گھورتی رہی۔
"وہ جو کچن میں مٹھائی پڑی ہے' اس پہ ہاتھ صاف کرلیا ہوگا۔ اب شوگر چیک کیوں کروائیں گے۔" اس کا انداز خفگی سے بھرپور تھا۔ انہوں نے نگاہیں چرائیں۔
"اس مٹھائی کو واپس بھجوا دو۔" انہوں نے کچھ سوچ کر فرمان جاری کیا تھا۔ وہ کچھ بھونچکی ہوئی۔
"کہاں؟ مطلب کہاں سے آئی ہے؟" اس کے انداز میں کچھ تجسس تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے تھے' پھر جیسے پھٹ پڑے۔
"اوپر سے آئی ہے۔ ویسے نہ کوئی تعلق داری' نہ میل' نہ ملاقات..... مہینوں شکل نہیں دکھائی ایک دوسرے کو..... اور مٹھائیوں کے لین دین چلتے ہیں۔ ایسی مٹھائی میں ان کے منہ پہ دے ماروں۔"
"کسی کے گھر سے آئی چیز واپس نہیں کرتے۔" وہ رسان سے بولی تھی۔ انہوں نے ناک چڑھالی۔
"اوپر سے آئے تو کردیتے ہیں۔" ڈیڈی اپنی بات پہ قائم تھے۔ ثانی نے گہرا سانس اندر کی طرف کھینچا تھا۔ پھر ملائمت سے بولی۔
"پھر واپس کی کیوں نہیں؟ رکھ کیوں لی ہے؟" اس کے سوال پہ لمحہ بھر کے لیے وہ جز بز ہوئے تھے' پھر چڑ کر گویا ہوئے۔
"وہ مہارانی خود باورچی خانے میں رکھ آئی۔" اپنے تئیں بڑا اچھا جواز پیش کیا تھا جو ثانی کو بھایا نہیں۔
"تو آپ کہتے ہمیں نہیں چاہیے۔ جب ملنا ملانا نہیں۔ اوپر نیچے آنا جانا نہیں۔ تو اس طرح کے لین دین کی کیا ضرورت ہے؟" ثانی سنجیدہ تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ پھر گہرا سانس بھر کے بولے تھے۔
"زیب کے نام کی مٹھائی تھی۔ کیسے واپس لوٹا دیتا۔" ان کے انداز میں گہری بے بسی تھی۔ ثانی نے بمشکل مسکراہٹ چھپائی تھی۔ پھر ایک دم چونک گئی تھی۔
"کس خوشی میں؟ کس سلسلے میں؟ کہیں آپ کے بھتیجے نے چھپ چھپا کر کورٹ میرج تو نہیں کرلی؟" اس کے انداز میں واضح شرارت تھی۔ ڈیڈی بھی اس کی شرارت کو سمجھ گئے تھے۔
"اس کی اتنی جرات نہیں۔ ماں سے پوچھے بغیر تو سانس نہیں لیتا۔ کورٹ میرج تو بہت دور کی بات ہے۔" ڈیڈی کا انداز جلا کٹا تھا۔
"میں تو مٹھائی کبھی نہ لیتا۔ خود کچن میں رکھ کر چلتی بنی۔ حد ہے ڈھٹائی کی۔" ڈیڈی کو پھر سے کچھ یاد آگیا تھا۔ ثانی چونک گئی۔ یہ بات انہوں نے کوئی چوتھی مرتبہ دہرائی تھی۔
"مٹھائی واپس کرنے کا کیا جواز تھا؟ آپ نے اچھا کیا رکھ لی اگر واپس کرتے تو چچی نے چار لگا کر زیب کو بتانا تھا۔ وہ خوامخواہ کبیدہ خاطر ہوتا۔" ثانی نے نرمی سے کہا تو وہ بھڑک اٹھے تھے۔
"وہ پہلے بھی ہم سے کبیدہ خاطر رہتا ہے۔ سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف جاتا ہے' کبھی اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ بیمار تایا کا حال پوچھ لے۔ کبھی برآمدے میں گھڑی بھر کے لیے نہیں آیا۔ سلام کرنا گوارا نہیں کرتا۔ جب تک ماں اجازت نہ دے۔ اس عورت کا زیب پہ پورا تسلط ہے۔"
ان کا غصہ بجا تھا۔ ثانی نے تسلیم کرلیا۔ کس قدر دل دکھانے والی بات تھی۔
"بڑا غرور ہے آپ کے بھتیجے کو اپنی اچھی صورت اور اچھی نوکری کا۔" ثانی کا دل بھی بھر آیا تھا۔ ڈیڈی جو کہہ رہے تھے' ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔
"اور اب اس کی پروموشن بھی ہوگئی ہے۔" ڈیڈی نے جل کر کہا تھا۔ کبھی زیب کی کامیابیاں انہیں دنوں مسرور رکھتی تھیں۔ وہ اسکول میں ٹاپ کرتا' کالج میں فرسٹ آتا' کھیل میں پہلا انعام جیتتا..... سب سے زیادہ ڈیڈی خوش اور پرجوش ہوتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ کیونکہ زیب کا رویہ بہت ہی لیا دیا سا ہوتا تھا۔ ٹھنڈا' خشک اور اجنبی۔
وہ جانے سوچوں کے تانوں بانوں میں کہاں تک الجھتی کہ ڈیڈی کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

"خود آکر مجھے مٹھائی دے کر جاتا تو کس قدر خوشی ہوتی۔ سیروں خون بڑھ جاتا۔ میں کوئی جلتا ہوں اس کی کامیابیوں سے۔" ڈیڈی کا وہی غصیلا انداز تھا۔ آف موڈ، جلا کٹا لہجہ۔ یعنی غصے کی اصل وجہ یہی تھی۔ وہ خود کیوں نہیں آیا۔

"اوپر جو رہتا ہے۔۔۔ خلائی مخلوق کے ساتھ مزاج تو ایسا ہی ہو گا نا۔" ثانی ان کا موڈ اچھا کرنا چاہتی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑے تھے۔

"اب تم اٹھو اور کھانا کھاؤ۔ بلکہ پہلے نہاؤ۔ بہت بو آرہی ہے پسینے کی۔" اب وہ اسے چھیڑ بھی رہے تھے اور اکسا بھی رہے تھے کیونکہ اس کا ارادہ فی الحال فریش ہونے کا نہیں تھا۔ وہ ڈیڈی کو کھانا کھلانا چاہتی تھی پہلے اور پھر دوائی۔ اس کے بعد ثانی کی اپنی باری آتی۔ ڈیڈی چاہتے تھے۔ وہ اتنی گرمی میں آئی ہے۔ پہلے تر و تازہ ہو جائے۔ پھر جب وہ فریش ہو کر گرم گرم لنچ تیار کر کے واپس کمرے میں آئی تو ڈیڈی کا مزاج پہلے سے اچھا ہو چکا تھا۔

"میری بیٹی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے تعریف کر رہے تھے۔ ثانی کا دل خوش ہو گیا۔

"تمہارا شوہر مجھے بڑی دعائیں دے گا۔" ڈیڈی کھانا کھاتے ہوئے شریر ہوئے تھے۔ ثانی ان کے پٹڑی بدلنے پر خفیف سی ہو گئی تھی۔

"اس زندگی میں تو امید نہیں لگتی۔" وہ بے خیالی میں کہہ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ اتنی یاسیت اچانک پھیلی تھی جس نے ڈیڈی کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے گم صم ہو گئے تھے۔

"تم نے ایسا کیوں کہا ثانی!" انہوں نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔ تب ہی ثانی کو اپنی بات کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ فوراً لہجے میں بشاشت بھر کے بولی تھی۔

"میری بات کا مطلب تھا۔ آپ کے بھتیجے سے امید نہیں۔ وہ میری کوکنگ کی تعریف کر دے۔" اس نے بمشکل ہی بات بنائی تھی۔ پھر انہیں اچانک خیال آیا تھا۔

"تم یاد سے اوپر مبارک باد دے آنا۔ پھر اس عورت کا پتا ہے نا۔ شوہر اور بیٹوں کے کان بھرے گی۔ تایا کو خوشی نہیں ہوئی۔ یاد نہیں زیب کی جب نوکری لگی تھی۔ تب کتنا ڈراما بنایا تھا اس نے۔ جب تم بیمار تھیں۔ ان کی دعوت میں جا نہیں سکی تھیں۔" ڈیڈی نے اسے بہت کچھ یاد دلایا تھا۔ ثانی کا دل بھر آیا۔ کچھ یادیں کتنی تلخ ہوتی ہیں۔

"آپ نہیں چلیں گے؟" ثانی نے بات پلٹتے ہوئے پوچھا تھا۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"ان گوڈوں گٹوں کے ساتھ اوپر جانا محال ہے، ضمیر سے بھی ملاقات نہیں ہو پاتی۔ وہ اوپر معذور اور میں نیچے۔ ایک دوسرے کی صورت کو ترستے ہیں۔ واہ مولا تیرے رنگ ہی نیارے۔" ڈیڈی نے پانی پیا اور ہاتھ پونچھ کر اخبار اٹھا لیا تھا۔ ثانی نے گہرا سانس کھینچا اور اٹھ کر برتن سمیٹنے لگی تھی۔

وہ جانتی تھی انہیں کس بات کا دکھ تھا۔ یہی نا کہ شاہ زیب خود کیوں نہیں مٹھائی دینے آیا؟ اور یہ شکوہ ان کا بجا تھا۔ اگر انگلیوں پہ گنتی تو کتنے ہی سال ہو گئے تھے شاہ زیب نے عید شب رات پہ بھی ان کے پورشن میں آنا چھوڑ دیا تھا۔

اور ایسا کیوں ہوا تھا؟ اور کس کی وجہ سے ہوا تھا؟ وہ اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اگر ایسا تھا تو ایسا ہی سہی۔

لیکن وہ جانتی تھی یہ محض سوچنے کی حد تک باتیں ہیں۔ ان پہ عمل وہ عمر بھر نہ کر سکتی تھی۔ وہ شاہ زیب کی ذات سے عمر بھر بے نیاز نہ ہو سکتی تھی۔

یہ عشق باکمال کی ادا تو نہیں تھی۔ محبوب کی سنگ دلی کا جواب سنگ اٹھا کر دینا؟

✲ ✲ ✲

اور اگلی صبح اتنی ہی مصروف ترین تھی۔ ویسی ہی بھاگ دوڑ، جلد بازی اور تیزیاں۔

ثانی دوپٹہ کس کے لپک جھپک صفائی میں مصروف تھی۔ پہلے تینوں کمرے سیٹ کیے۔ پھر کچن رگڑا۔ اور

پھر برآمدے اور صحن کو اشکانے لگی تھی۔

آج اس کی آنکھ تھوڑا لیٹ کھلی تھی سواسی حساب سے اس کے ہاتھ بھی تیز چل رہے تھے۔ ابھی کھانا بھی بنانا تھا۔

آج اس نے اکیڈمی تھوڑا دیر سے جانا تھا۔ وہ فائن آرٹ اکیڈمی میں آرٹ ٹیچر تھی۔ یہ ایک معروف مقامی اکیڈمی تھی۔ اچھی خاصی تنخواہ مل جاتی تھی۔ اور ثانی اس اکیڈمی کے ماحول سے بھی مطمئن تھی۔ لیکن ڈیڈی بہت نالاں تھے۔ دراصل ثانی کے چلے جانے کے بعد وہ تنہائی محسوس کرتے تھے۔ اوپر والوں کی رونق بس اوپر تک ہی محدود تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں کبھی کسی نے نیچے جھانک کر ڈیڈی کا حال پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی وہ سب مصروف ہوتے تھے۔ شاہ زیب اپنی جاب میں اور اس کے چھوٹے چاروں بھائی کالجز اور اسکولز میں۔ افزاء گورنمنٹ کالج سے ماسٹرز ان اکنامکس کر رہی تھی۔ آج کل اس کے پیپر چل رہے تھے۔ ویسے بھی اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ افزا کا کون سا ان سے کوئی قلبی یا خونی تعلق تھا۔ جو ثانی اس سے توقعات وابستہ رکھتی۔ اصل دکھ تو شاہ زیب کی لاپروائی کا تھا۔ جو ہر گزرتے دن کے ساتھ پہلے سے بڑھ کے اجنبی ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا راستے میں روک کر پوچھ ہی لے۔ اس لاتعلقی کے پیچھے کیا وجہ ہے؟ لیکن وہ جانتی تھی۔ یہ محض سوچ کی حد تک ممکن تھا۔ وہ ایسی بہادر ہرگز نہیں تھی۔

اور اس وقت وہ زور و شور سے فرش دھوتی مسلسل زیب کے متعلق سوچ رہی تھی۔ معاً "گیٹ پہ بجنے والی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

وہ گہرا سانس کھینچتی پائپ سمیٹ کر گیٹ تک آئی۔ گیٹ کھولا تو سامنے ہارون کو کھڑا دیکھ کر چونک گئی تھی۔ وہ اپنی ازلی مسکراہٹ کے ساتھ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا تھا۔ ہارون کو غیر متوقع اپنے سامنے دیکھ کر ثانی بے ساختہ چونک گئی تھی۔

"سلامتی ہو؟ کیسے احوال ہیں؟ مانا کہ بڑا اچھا لگ رہا ہوں۔ لیکن ایسی بھی کیا محویت!" وہ اپنے بے ساختہ انداز میں بولتا اسے بری طرح سے جھل کر گیا تھا۔ پھر اپنے بکھرے حلیے پہ دھیان گیا تو شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ جلدی سے بکھری لٹوں کو سمیٹا۔ شلوار کے پائینچے نیچے کیے، صحن کی کھونٹی سے دوپٹہ اتار کر اوپر لیا۔ تب تک ہارون برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پیچھے آ گئی تھی۔

"لوگ مجھے دیکھ کر ایسے ہی ہپناٹائز ہو جاتے ہیں۔"

اسے لال بھبھوکا دیکھ کر ہارون کو شرارت سوجھی تھی۔ ویسے بھی وہ بلا کا شرارتی تھا۔ ہنس مکھ اور خوش مزاج بھی۔

ثانی نے گہرا سانس اندر کی طرف کھینچا۔ اور ذرا سنجیدہ انداز میں بولی۔

"بڑی خوش فہمی ہے تمہیں۔" اس کا انداز بھی جلانے والا تھا۔

"خوش فہمی نہیں۔ اسے خود آگاہی کہتے ہیں۔" ہارون نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ثانی نے ہونہہ پہ ہی اکتفا کیا تھا۔ ہارون ہنسنے لگا۔

"مزاج یار اتنا جلا ہوا کیوں ہے؟" کچھ دیر بعد وہ بڑی ہمدردی سے پوچھ رہا تھا۔ ثانی جو اس کے لیے اسکواش بنانے کچن میں چلی گئی تھی۔ کچن کی کھڑکی سے گردن نکال کر بولی۔

"تمہاری شکل جو دیکھ لی ہے۔"

ہارون کین کی کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"یعنی کہ میری شکل دیکھ کر؟" اسے جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔ "بی بی! اپنی آنکھوں کا علاج کرواؤ۔ مجھے دیکھ کر تو مٹیاریں رستہ بھول جائیں۔ ایسی نورانی صورت ہے میری۔ پیاری پیاری لڑکیوں کا تو دل ہی نہیں بھرتا مجھے دیکھ دیکھ کر۔" وہ تو تڑپ ہی اٹھا تھا۔

"پیاری پیاری لڑکیوں کا دل نہ بھرتا ہو گا۔ میرا تو نہیں۔" اس نے منہ بنا کر جواب دیا تھا۔ پھر جگ میں چینی گھولنے لگی۔

"اس کا مطلب ہے تم تسلیم کرتی ہو کہ تم پیاری نہیں۔"

"ہاں' کرتی ہوں پھر؟" اسے غصہ آیا تھا۔ باہر سے ہارون کی چلبلاتی آواز ترنت آئی تھی۔

"پھر تو تمہاری نظر واقعی چیک کروانی پڑے گی۔ اے احساس کمتری کی ماری خاتون! تمہارا تو کوئی حال ہی نہیں۔ جیسا تمہارا چمکتا گورا رنگ ہے اس کے لیے لڑکیاں بیوٹی کریموں پہ زر کو آگ لگاتی ہیں اور تمہیں قدر ہی نہیں۔" ہارون نے جیسے تاسف کا اظہار کیا تھا۔ ثانی نے گہرا سانس بھرا۔

"گورے رنگ کو خوب صورتی کی علامت نہیں سمجھا جاتا۔" اس نے اپنے بھیگے ملائم دودھیا ہاتھوں کو دوپٹے سے پونچھا اور جگ اٹھا کر باہر آ گئی تھی۔

"یہ یقیناً" اوپر والوں کا ارشاد ہو گا۔" ہارون فوراً" ہی معاملے کی تہہ میں اتر گیا تھا۔ ثانی نے آہ سی بھری تھی۔ اپنی لمبی زبان کے باوجود ہارون اس کا مزاج آشنا تھا۔ اسے ماننے ہی بنی تھی۔

ہارون اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔ انتہائی ملائم سا شفاف چہرہ' بے ریا آنکھیں۔ ذرا پھیلی سی ناک۔ جاپانیوں جیسی۔ سادہ چہرہ' عام سے نقوش اور بے تحاشا گوری رنگت۔ وہ کہیں سے بھی اتنی معمولی نہیں لگتی تھی' جس قدر وہ خود کو عام اور معمولی سمجھتی تھی۔ خاص طور پہ اس کی گلابوں سی رنگت عام سے نقوش کو ڈھانپ لیتی تھی۔ جانے وہ کیوں کمپلیکس کا شکار رہتی تھی۔ شاید اوپر والوں کی وجہ سے۔

"اب ایسی بھی بات نہیں۔" ثانی نے فوراً" خود پہ قابو پایا تھا۔ خود کو ارزاں کرنا اسے گوارا نہیں تھا۔

"مجھے لگتا ہے تم افزا سے خاصی متاثر ہو۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پھر سے بارود چھوڑا تھا۔ اب کے ثانی ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"یہ بے پر کی کس نے اڑائی ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق بھلا؟" وہ مارے غصے کے ایک دم بولتی چلی گئی تھی۔

"میرے دماغ نے۔" ہارون نے فوراً" تسلیم کر لیا تھا۔

"تم اپنے دماغ کا علاج کرواؤ۔" ثانی نے چڑ کر مشورہ دیا تھا۔

"اور تم آنکھوں کا۔ یہی بتانے تمہیں آیا تھا۔ ورنہ اس گرمی میں گھر سے نکلنا محال تھا۔ سوچا' تمہاری آنکھیں کھول آؤں۔ بلکہ علاج کا مشورہ دے آؤں۔" وہ بے تکی ہانکتا اسے چونکا گیا تھا۔ ثانی کا دل عجیب سے خدشے کے تحت کپکپایا تھا۔

"اس بک بک کا مطلب؟" وہ اپنی پریشانی اس پہ ظاہر کیے بغیر تڑخ کر بولی تھی۔ ہارون آنکھیں میچ کر اسے دیکھتا رہا۔ ساتھ ساتھ اسکوائش کا جگ بھی خالی کرتا رہا۔

"بڑا عام سا مطلب ہے۔ تمہارا ٹائی ٹینک ڈوبنے کے قریب پہنچ چکا... اور میں تمہارا نقصان ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہی بتانے آیا تھا۔ کوئی ہاتھ پاؤں ہلالو تم اور ماموں۔" وہ کیا بات کر رہا تھا۔ اسے سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی تھی۔

"تو میں کیا کر سکتی ہوں؟" وہ اتنی بے بس تھی کہ بس رو دینے کی کسر باقی رہ گئی۔ ایک تو ہارون کے سامنے کچھ بھی چھپانا محال تھا۔

"بس تمہاری یہی بزدلی میری نیا بھی ڈبوئے گی۔" ہارون نے تاسف سے جتلایا تھا۔ ثانی اس کی گفتگو کا پس منظر سمجھ گئی تھی۔

"تو تم خود کیوں نہیں تیس مار خان بن جاتے؟ ویسے تو ساری پھنے خانیاں آتی ہیں۔" تب ہارون دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کے واکنگ چیئر پہ جھولنے لگا تھا۔ جیسے کسی سوچ میں ڈوب گیا ہو۔

"میں تیس کے بجائے پچاس مار خان بھی بن سکتا ہوں۔ اگر بیچ میں ہیبت ناک سماج نہ ہو۔" اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ وہ سمجھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی تھی۔

"سماج نے تو بیچ میں ہی رہنا ہے۔" اس نے ہارون کو بے ساختہ ڈرایا تھا۔

"صرف رہنا ہی نہیں... اپنی طرف سے سارے گر بھی آزمانے ہیں اور تم دیکھ لینا۔ وہ اپنا مقصد پانے میں ہر حد سے گزر جائیں گی۔" "معاً" ہارون بے ساختہ

سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"تمہیں میرا غم زیادہ ہے یا اپنا؟" کچھ دیر بعد ثانی گہری سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔ ہارون نے لمحہ بھر کے لیے جھولنا موقوف کیا تھا۔ پھر آنکھیں میچتا بے ساختہ بولا۔

"دونوں کا۔ اب اگر تم نے ہمت نہ کی تو یہ نیا ڈوب جائے گی۔"

ہارون کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔ یہ عام خدشات نہیں تھے ان کے پیچھے بہت کچھ تھا۔ سول ایوی ایشن کی بہترین جاب اور شاہ زیب کا نہ نظرانداز کرنے والا سراپا۔ اس کی فرماں برداری اور ان سب کے لیے انتہا درجے کی کیئر' محبت' خیال' کیا شاہ زیب سے دست بردار ہونا "اس" کے لیے بھی آسان تھا؟ وہ جس کے لیے راہیں ہموار کرنے والے موجود تھے۔ وہ جنھوں نے زیب کو ان سے دور کرنے کے لیے ایک دیوار کا کام کیا تھا؟ کیا وہ لوگ اتنی آسانی سے زیب کو وہاں سے لے کر یہاں تک کا فاصلہ طے کرنے دیتے؟ شاید کبھی نہیں۔

ہارون کے سینے سے ایک سرد آہ برآمد ہوئی تھی۔ اور اس کی بے قرار نگاہیں سیڑھیوں کی اونچائی تک جاتی اور پھر نامراد اسی پلٹ آتی تھیں۔

ثانی اس کی بے چینی کو سمجھتی تھی۔ اسی لیے اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے بولی۔

"مجھے باتوں میں لگالیا میں اکیڈمی سے لیٹ ہو رہی ہوں۔" اس کا انداز آخر میں ڈپٹنے والا ہو گیا تھا۔ ہارون نے ایک لمبی آہ بھری تو کچھ دیر پہلے والی یاسیت سے پیچھا چھڑاتا ہوا مسکرایا تھا۔

"خادم اس جرم پہ سزا بھگتنے کے واسطے تیار ہے۔" وہ تھوڑا جھکتے ہوئے کورنش بجالایا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی تھی۔

"تو پھر اٹھو اور مجھے اکیڈمی ڈراپ کردو۔" اس نے ہارون کے کندھے پہ ایک دھپ لگائی تھی' پھر اپنا سامان لینے اندر چلی گئی۔ پھر جب وہ واپس آئی تو ہارون اپنی بائیک کی چابیاں اچھالتا ایڑیوں کے بل اچک اچک کر اوپر دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے کسی گلابی آنچل کی جھلک دکھائی دی تھی۔ نگاہیں دید کی پیاس لیے مایوس سی واپس پلٹیں تو سامنے ہی ثانی کو گھورتے دیکھ کر وہ ڈھٹائی سے ہنس پڑا تھا۔

"دیکھ لو' ثانی! ہم دونوں کی منزل ایک ہی ہے۔ یہ ماربل کی سیڑھیاں اور اوپر کا پورشن....." وہ اپنی بات کا خود ہی مزہ لیتا تھا' آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے ثانی تھی۔ جو اپنی فائل اس کے کندھے پہ مار رہی تھی۔

"لیکن مجھے اپنی منزل کو ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔" اس کے جواب نے ہارون کو بڑا ہی محظوظ کیا تھا۔ وہ مسکاتا ہوا گردن گھما کر بولا۔

"اس لیے کہ تمہاری منزل قریب اور محبوب آنکھوں کے سامنے ہے۔ دن میں ایک مرتبہ تو دید سے آنکھیں سیراب ہو جاتی ہیں۔ جناب اکھڑے اکھڑے ہی سہی کم از کم دکھائی تو دیتے ہیں۔" ہارون نے ایک آہ بھری اور بات کو مزید جاری رکھا "اور ایک اپنی پھوٹی قسمت ہے۔ کبھی تو دیدار نصیب ہو....."

"اتنی آہیں مت بھرو اور اوپر خود جا کر درشن کروا آؤ۔ کیا خبر اوپر بھی کسی کو انتظار ہو۔ تمہارے یہ شعلہ نما جذبے رنگ دکھا ہی جائیں۔" اس کا انداز صاف پچکارنے والا تھا۔

"تمہارے منہ میں گھی شکر....." وہ کھلکھلایا تھا۔ پھر اچانک غصے میں بولا۔ "لیکن جب تک زیبو اپنی افسری سمیت کھونٹے سے نہیں بندھتا۔ میری نیا بیچ منجدھار میں ہی پھنسی رہے گی۔" اس نے دائیں ہاتھ کا مکا ہوا میں اچھالا تھا۔ ثانی نے اسے زیادہ جذباتی ہوتے دیکھا تو ہاتھ پکڑ کر بائیک تک لے آئی۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"خدارا..... یہ مکالمے بعد میں کرلینا۔ مجھے اکیڈمی چھوڑ آؤ پہلے....." پھر اس نے بائیک اسٹارٹ کی تو ثانی محتاط سی اس کے کندھے کا سہارا لے کر بائیک پہ بیٹھ گئی تھی۔ پھر زن سے بائیک زوں زوں کرتی کیپٹن خضر حیات کے مکان سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ جانے

والوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں تھا۔ دھوپ بھری اس دوپہر میں ماربل کی سیڑھی کے سب سے اوپر والے قدمچے پہ کوئی کھڑا تھا۔ لال انگارہ آنکھیں لیے۔ جن سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور چہرے پہ ایسے برف سے تاثرات تھے کہ دیکھنے والی نگاہ تک برف ہو کر جم جاتی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس چلا گیا۔

٭ ٭ ٭

کچن سے پریشر ککر کی سیٹی بجنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔

پورے گھر میں اشتہا انگیز سی خوشبو پھیلی تھی۔ امی بریانی کے ساتھ کڑاہی گوشت بنا رہی تھیں۔ وہ سب بچوں کی پسند کا خیال رکھتیں۔ حسن، احسن، رمیز، سمیر... لیکن عموماً "مینیو" شاہ زیب کی پسند کا ہوتا تھا۔ نائلہ کے ہاتھ میں لذت بہت تھی۔ عام سی ترکاری بھی ایسی مزے کی پکاتی تھیں کہ کھانے والا انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔ تب ہی تو اتنے سال بعد بھی ضمیر کا دل نائلہ کے دل کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور شاید معدے کے ساتھ بھی... اور وہ اس چھوٹی سی راجدھانی کی اکیلی ملکہ تھیں۔ وہ ہر فیصلے میں کار مختار تھیں۔ گھر کی خریداری سے لے کر خاندان میں لین دین... حتیٰ کہ بچوں کی زندگیوں کے متعلق ہر فیصلہ کرنے میں... اور انہیں اپنی بات منوانے کے سارے گر بھی آتے تھے۔

شاہ زیب بڑا بیٹا تھا۔ ہر لحاظ سے پرفیکٹ، کماؤ، فرماں بردار...

زیب کی تنخواہ پر سارا گھر چل رہا تھا۔ اس کی اچھی تنخواہ کی وجہ سے چھوٹے چاروں بھائی اچھے پرائیویٹ کالجز میں پڑھ رہے تھے۔ افزا حال ہی میں تعلیم سے فارغ ہوئی تھی۔ اب نائلہ کو اس کی شادی کی فکر تھی۔ زیب ساری تنخواہ ماں کے ہاتھ پہ رکھ دیتا تھا۔ بس اپنی ضرورت کے لیے مختصر رقم پاس رکھتا۔ ویسے بھی اس کی ضرورتیں بہت محدود تھیں۔ ابو کا علاج، دوائیں اور گھر کے اخراجات ہی اتنے تھے کہ اسے لگتا تھا نائلہ بہت مشکل سے گھر چلاتی تھیں۔ شاہ زیب اپنے بہن، بھائیوں کا بہت احساس کرتا تھا۔ بچوں میں محبت و یگانگت نائلہ کے لیے دلی سکون کا باعث تھی۔ وہ چاہتی تھیں ان کے سب بیٹے ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہیں اور یہ تب ہی ممکن تھا جب شاہ زیب کی زندگی کا فیصلہ ان کے حسب منشا ہو جاتا اور یہ ان کے لیے بہت آسان تھا۔ وہ بس کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھیں۔ جس کے بعد ان کا برسوں پرانا خواب پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا۔

وہ کچن سے باہر نکلیں تو شاہ زیب اندر آتا دکھائی دیا تھا۔ آج وہ آفس سے جلدی اٹھ آیا تھا۔ چہرے سے تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ اور گال گلابی... ناک بھی لال ہو رہی تھی۔ شاید فلو کی شکایت تھی۔

ہاتھ میں لیدر کا دفتری بیگ، لیپ ٹاپ، موبائل... آج وہ یونیفارم میں نہیں تھا۔ شلوار قمیص میں تھا۔ پیپر کاٹن کی سفید شلوار قمیص اس کے وجیہہ سراپے کا مول بڑھا رہی تھی۔ اونچا لمبا، اسمارٹ سا زیب... ان کے دل میں سیدھا اتر گیا تھا۔ انہوں نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔ اپنی ہی نظر لگ جانے کا خدشہ ہوا تھا۔

"آج جلدی آ گئے بیٹا!" انہوں نے بھاگم بھاگ اس کے ہاتھ سے چیزیں پکڑیں... پھر سمیر کو آواز دی۔ "بھائی کا سامان اندر رکھ آؤ... اور اس کے سلیپر لے آؤ۔"

کچھ دیر بعد سمیر بمعہ سلیپر سمیت نمودار ہوا تھا۔ نائلہ نے افزا کو آواز دی تھی۔

"کہاں ہو افزا! نکل آؤ اپنے کمرے سے۔ جانے یہ لڑکی سارا دن کیا کرتی ہے۔ اب تو امتحانوں کا بہانا بھی گیا۔"

ان کی اونچی آواز پہ افزا ہڑبڑا کر باہر آ گئی تھی۔ سامنے ہی شاہ زیب کو دیکھ کر جھجک گئی۔ پھر اس کے سرخ چہرے پہ نگاہ پڑی تو ماں سے اشارہ میں پوچھا۔

"بھائی کو کیا ہوا؟" اس کے لہجے میں واضح تفکر تھا۔

نائلہ نے جواباً گھور کر تنبیہہ کی تھی۔ وہ جیسے سمجھ کر کچھ چپ سی ہو گئی تھی۔ پھر اس نے ہمت کر کے شاہ زیب کے قریب آ کر پوچھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اپنے کمرے میں چلے جائیں۔ میں جوشاندہ بنا لاتی ہوں۔" افزا کی آواز پہ شاہ زیب چونک گیا تھا' لیکن اس نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹائے تھے۔ معاً اسے اپنے پیروں پہ سرسراہٹ سی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھ کی جھری سے دیکھا اور دھک سے رہ گیا تھا۔ افزا اس کے جوتے اتار رہی تھی۔ شاہ زیب کو کرنٹ سا لگا تھا۔ وہ تیزی سے پیر سمیٹ کر اٹھ بیٹھا۔

"یہ کیا کر رہی تھیں افزا....؟" اس کا تنفس کچھ تیز تھا اور چہرہ پہلے سے بھی لال.... افزا تھوڑا ڈر کے خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔

"جوتے اتار رہی تھی۔" اس نے سہمے انداز میں جواب دیا تھا۔ زیب گہرا سانس بھر کے رہ گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے تیز لہجے پہ قابو پا لیا تھا۔

"بری بات افزا! آئندہ ایسا نہیں کرنا۔ میرے پیروں کو ہاتھ نہیں لگانا۔ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔" وہ ملائمت سے تنبیہہ کر رہا تھا۔ افزا کچھ شرمندہ ہو گئی تھی۔

"سوری...." اس نے فوراً" کانوں کو ہاتھ لگا لیے تھے۔ زیب اس ادا پہ ذرا سا مسکرا دیا۔

"تم کبھی بھی بڑی نہیں ہو گی۔"

"میں بڑی ہو چکی ہوں۔" افزا نے بے ساختہ کہا تھا۔ وہ ایڑیوں کے بل تھوڑا اونچا ہو کر اسے دکھا رہی تھی۔ شاہ زیب مسکرا دیا۔

"ہاں.... اس لحاظ سے بڑی ہو۔ مگر عقل کے معاملے میں زیرو...." اب وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ افزا ٹھنکنے لگی۔

"زیبی بھائی! آپ بھی نا...."

نائلہ جب دوبارہ چھوٹے سے لاؤنج میں آئیں تو افزا کو ٹھنکتے پا کر ان کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"جانے یہ گدھی کب بڑی ہو گی۔" انہوں نے اندر ہی اندر تلملاتے ہوئے سوچا تھا۔ پھر زیب کی طرف جوشاندے والا مگ بڑھا کر بولیں۔

"اسے پی لو بیٹا! تھوڑا افاقہ ہو گا اور اب تم آرام کرو۔" وہ بہت محبت سے زیب کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جو کنپٹیاں مسلتا ہوا مگ پکڑ کے اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔

نائلہ نے فکرمندی سے دیکھا۔

"میں ذرا کچن میں بزی ہوں۔ افزا! تم ایسا کرو تیل اٹھا لاؤ۔ زیب کے سر میں مالش کر دو۔ دیکھنا کتنا سکون آتا ہے۔" نائلہ کے کہنے پہ افزا سر ہلاتی تیل لینے باہر گئی تو شاہ زیب نے فوراً" ماں کو منع کیا۔

"رہنے دیں امی! اس کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں ضرورت نہیں۔ دیکھنا آرام آ جاتا ہے فوراً"...." نائلہ نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تھا۔ شاہ زیب جیسے بے بس ہو گیا تھا۔ تاہم افزا سے ایسے کام کروانا اسے پسند نہیں تھا۔ یہ تو امی نے اسے سر میں تیل ڈلوا کر مالش کروانے کی عادت ڈال رکھی تھی۔ وہ اتوار کے اتوار ان چاروں بھائیوں کو زبردستی اپنے گھٹنوں تلے دبوچ لیتی تھیں۔

لیکن کچھ عرصے سے امی نے بہت سی ذمہ داریاں افزا کے اوپر ڈال دی تھیں۔ خاص طور پہ شاہ زیب کے سارے کام.... اسے کھانا دینے سے لے کر کپڑوں تک.... امی' شاہ زیب کی ہر ضرورت کے لیے افزا کو آواز دیتی تھیں۔ اپنے کام کے لیے اسے زحمت دینا شاہ زیب کو پسند نہیں تھا۔

جب اس نے دبے لفظوں میں امی کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہی تو امی الٹا برا مان گئی تھیں۔

"اپنے باقی بھائیوں کے کام بھی تو کرتی ہے۔ بلکہ وہ ڈنکے کی چوٹ پہ زبردستی اس سے کام کرواتے ہیں۔ تم نے ایسا کیوں کہا؟ کیا افزا اس گھر کا فرد نہیں ہے؟" امی کے پاس دلائل کی کمی نہیں تھی۔

جب سے افزا پڑھائی سے فارغ ہوئی تھی۔ گھر کی آدھی ذمہ داری اس نے اٹھا رکھی تھی۔ ایک لحاظ سے یہ بھی بہتر تھا۔ امی کا بوجھ کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ ابو کی دیکھ

بھال ‘ ان کی تیمارداری کے ساتھ ساتھ پورے گھر کو امی نے سنبھال رکھا تھا۔ وہ پورے دن کی بھاگ دوڑ سے اب تھک جاتی تھیں۔

اور اس وقت افزا کے ہاتھ میں تیل کی بوتل دیکھ کر زیب کو کوئی مناسب بہانا نہیں سوجھ رہا تھا۔

امی کا اشارہ پاکر افزا نے **جھجکتے** ہوئے ہتھیلی پہ تیل لیا۔ شاہ زیب کے بالوں کا مساج کرنے لگی تھی۔ امی قریب بیٹھی سلاد کاٹ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ ہدایات بھی دیتیں۔ افزا نے تنگ آکر بول ہی دیا تھا۔

"اس سے بہتر تھا‘ آپ خود کرلیتیں۔" اس کے جواب پہ زیب خاصا محظوظ ہوا تھا۔ اس کے جادو اثر مساج کا اثر تھا کہ زیب کو صوفے پہ ہی نیند آگئی تھی۔ وہ افزا کا شکریہ بھی ادا نہیں کرسکا۔ جوشاندے نے بھی خاصا افاقہ دیا تھا۔ وہ سکون کے ساتھ نیند میں گم ہوگیا تھا۔

تب نائلہ نے افزا کو اشارہ کیا اور خود بھی چیزیں سمیٹ کر کچن میں آگئی تھیں‘ ساتھ سمیرو غیرہ کو تنبیہہ بھی کی۔

"بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ سو رہا ہے۔ خبردار جو ہاہاکار مچائی تو۔۔۔"

افزا نے بھی ہدایت نامہ دھیان سے سنا تھا۔ پھر سلاد کے پتے کھاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"امی! ایک بات کہوں؟" اس کا انداز پرسوچ قسم کا تھا۔ گہرا سنجیدگی بھرا۔ نائلہ نے بیٹی کے چہرے پہ پھیلی کشمکش کو دیکھا اور گہرا سانس بھر کے رہ گئی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ کہو۔۔۔" نائلہ کا انداز مصروف قسم کا تھا۔ وہ کڑاہی تیار کرنے میں مگن تھیں۔ ابھی آٹا گوندھ کے روٹی پکانی تھی۔ تب تک شاہ زیب بھی اٹھ جاتا۔ یہ سارا **مینیو** شاہ زیب کی پسند کو مدنظر رکھ کے بنایا گیا تھا۔

"امی! جو آپ چاہتی ہیں‘ کیا ایسا ممکن ہے؟" افزا کے لہجے میں بلا کی جھجک تھی۔ نائلہ کچھ چونک گئیں۔ پھر انہوں نے گردن گھما کر بیٹی کی طرف دیکھا تھا۔

"اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ مجھے پتا ہے کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے‘ لیکن ایک طرف سے دل کو سکون بھی ہے۔"

افزا ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"زیب کی طرف سے میں مطمئن ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات کسی قیمت پہ بھی نہیں ٹالے گا۔ رہا ضمیر۔۔۔ تو اسے میں دیکھ لوں گی۔" نائلہ نے سب کچھ خود ہی طے کرر کھا تھا۔

"امی! کیا نیچے والے خاموش رہیں گے۔" افزا نے انتہائی بے چینی کے عالم میں پوچھا تھا۔

"یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔ جب شاہ زیب ڈٹ گیا تو کون آواز اٹھائے گا؟ میرا ہتھیار زیب ہے۔ میرا بیٹا۔۔۔ مجھے کبھی بھی نیچا ہونے نہیں دے گا۔" نائلہ کے لہجے میں مان بول رہا تھا۔ افزا ماں کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

ان کی اس خواہش میں اتنی شدت تھی کہ وہ اکثر ڈر جایا کرتی تھی۔ ان کی خواہش کے ادھورا رہ جانے کے خوف کی وجہ سے۔۔۔ کیا ضروری تھا ساری تمنائیں پوری ہوجاتیں؟

"یہ میری زندگی کی اولین تمنا ہے۔ پہلی اور آخری خواہش۔۔۔" اور جب وہ ببانگ دہل ابو کے سامنے اعلان کرتی تھیں تو ابو کا چہرہ ایک دم سفید پڑجاتا تھا۔ تب اگر امی کبھی ابو کا بے رنگ چہرہ دیکھ لیتیں یا اس چہرے پہ امڈ آئی‘ حسرتوں کا شمار کرلیتیں تو انہیں احساس ہو ہی جاتا۔ اسی لیے امی نے کبھی ابو کا چہرہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ افزا ہونٹ کچلتی ماں کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ اب بھی سکون کے ساتھ تن دہی سے کڑاہی پکانے میں مگن تھیں۔

جبکہ وہ ہزار خدشوں اور وسوسوں کے حصار میں گھری تھی۔ بے یقینی کی ناؤ میں ڈولتی ہوئی۔ آر یا پار ہونے کے فیصلے کی سولی پہ اٹکی ہوئی۔

کتنا عذاب ناک تھا اس شخص کی ہاں یا نا کے درمیان سفر کرنا جو بہت کم عرصے میں نظر اور دل کی دنیا کو تہہ بالا کر گیا تھا۔

اس نے ہمیشہ امی کے منہ سے یہ ہی سنا تھا۔ اسے اسی گھر میں رہنا ہے اور شاہ زیب کے حوالے سے رہنا

ہے۔ افزا کو آج بھی وہ سرمئی سی شام یاد تھی۔ جب سہ پہر ڈھلے اس کی کالج فیلو اپنی ماں کے ساتھ افزا کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لائی تھی۔

”افزا کا رشتہ تو طے ہے تقریباً“۔ اب تو بس رسم کی تاریخ رکھوں گی۔ اس لیے میں معذرت کرتی ہوں۔“ سارہ کی امی کے اصرار پہ نائلہ نے بتا دیا تھا کہ افزا کا رشتہ کس سے طے ہے۔

یہ سن کر وہ ماں بیٹی مایوس سی واپس لوٹ گئی تھیں، لیکن افزا کے دل کی دنیا تو تہہ وبالا ہو چکی تھی۔ یہ امی نے کیا کہہ دیا تھا؟

اس کا رشتہ زیب بھائی سے طے تھا؟ کب کس طرح.....؟

وہ ان سوالوں میں نہیں پڑ رہی تھی۔ اس کے دل کی خوشی اور اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

شاہ زیب ضمیر علی..... کاکول اکیڈمی میں پی آئی اے کے اسپیشل کوٹ میں پڑھنے والا اور اپنے شان دار اکیڈمک ریکارڈ کے ساتھ اتنا خوبرو ایرونا ٹیکل انجینئر..... وہ تو ایک خواب تھا۔ وہ تو آسمان کا چاند تھا۔ تو پھر افزا کے نصیب میں کیسے آ گیا؟

اسے کئی راتیں نیند ہی نہیں آئی تھی۔ وہ رات رات بھر جاگتی..... اور زیب بھائی کو سوچتی..... پھر اسے خود ہی شرم سی آ جاتی تھی۔ اکثر اسے خیال آتا کہ زیب کی اس کے لیے جانے کیسی فیلنگز ہوں۔ وہ تو بڑا نارمل ری ایکٹ کرتا تھا۔ کسی خاص جذبے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا یا شاید اسے خود پہ کنٹرول تھا۔ لیکن افزا کے اندر کے موسم بدل چکے تھے۔ وہاں اب محبت میٹھا میٹھا درد جگاتی تھی۔ وہ بچپن کی انسیت اور زیب کا خصوصی لگاؤ بہت طریقے سے محبت اور الفت میں ڈھلنے لگا تھا۔

حالانکہ زیب تو وہی تھا۔ ہمیشہ والا زیب..... خیال رکھنے والا..... پیار کرنے والا..... جب تک وہ کالج جاتی رہی تھی۔ باقی چاروں کے ساتھ اسے بھی الگ سے پاکٹ منی ملتی تھی۔ زیب بھائیوں کے لیے شرٹس لاتا تو امی اور افزا کے اسپیشل سوٹ ہوتے، گرمیوں، سردیوں کی ورائٹی بن کے پہنچ جاتی۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جاتا اور امی اسے اور طریقوں سے باور کرواتی تھیں۔

”دیکھا..... زیب کو ابھی سے تمہارا کتنا خیال ہے۔“ اور افزا بہت شرما جاتی تھی۔ گھبرا جاتی..... جھینپ جاتی..... یہ احساس کتنا دل نشین تھا کہ کوئی آپ کا اس قدر خیال رکھتا ہے؟ لیکن زیب تو پہلے بھی بہت خیال رکھتا تھا؟ ہاں اب اس کی جاب ہو چکی تھی تو خیال رکھنے کے طریقوں میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔

امی نے اسے سوچوں میں گم کھویا کھویا دیکھا تو نرمی سے اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ انہوں نے برنر گھما کر آنچ دھیمی کر لی تھی۔ انہوں نے پیار سے اس کا دلنشین چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لیا۔

”تمہیں کس بات کا غم ہے؟ کیا تمہیں اپنی ماں پہ بھروسا نہیں؟ میں تمہاری ماں ہوں' افزا مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ میں تمہاری خوشی کے لیے سب کچھ کروں گی۔ جو بھی مجھ سے ہو سکا.....“ ان کے یقین بھرے لہجے پہ افزا بمشکل ہی لبوں پہ کھینچ تان کر مسکراہٹ لا سکتی تھی۔ حالانکہ دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ کیونکہ بیچ میں کیپٹن خضر حیات ریٹائرڈ اور ان کی دختر ایک اٹل حقیقت کی طرح کھڑی تھی تن کر اور امی تھیں کہ اس خوف ناک حقیقت سے اتنے آرام کے ساتھ نگاہیں چرائے بیٹھی تھیں۔ اس کی آنکھوں کا ہراس اور سوچوں کا عکس چہرے پر بہت واضح تھا۔ جسے دیکھ کر امی نے گہرا سانس بھرا اور نرمی سے بولیں۔

”تمہیں ثانی کی وجہ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ثانی بہت عرصہ پہلے سے ہی زیب کی زندگی سے نکل گئی تھی اور اگر کوئی رہی سہی کسر باقی ہوئی بھی تو اس کے لیے میں ہوں نا۔“ انہوں نے اس کا گال تھپتھپا کر ہمت بندھائی تھی۔ وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی..... بہت چاہ کر بھی اس کے چہرے پہ مسکراہٹ نہ آ سکی تھی۔

☆ ☆ ☆

کچن میں کھانا تیاری کے آخری مراحل میں تھا۔ نائلہ گرم گرم چپاتیاں بنا رہی تھیں، جبکہ افزا چھوٹی سی میز پہ کھانا لگا رہی تھی۔ میز کافی پرانی تھی۔ گھسی ہوئی... رنگ اڑی... نائلہ نے سوچ رکھا تھا۔ شاہ زیب کی شادی سے پہلے سارا فرنیچر بدلوائیں گی۔ آخر افزا کو جہیز بھی تو دینا تھا۔ اوپر فرنیچر کم بھی تھا اور معمولی بھی...

ضمیر کی آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ بمشکل گھر کے اخراجات پورے ہو سکتے تھے۔ اس لیے وہ اپنا گھر سجانے کا شوق پورا نہ کر سکیں۔

پھر بچے ہوئے تو ان کے خرچے... پڑھائیاں، مہنگی تعلیم... یہ تو زیب کمانے کے قابل ہوا تو حالات میں بہتری آئی تھی۔ نائلہ نے بڑے ہی تنگی کے دن دیکھے تھے۔ یہ بھی ایک الگ ہی داستان تھی۔ وہ بھی دن گزر گئے۔ اب اچھے دن آئے تھے تو وہ ان اچھے دنوں کو گنوانا نہیں چاہتی تھیں۔ اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھیں۔

ابھی بھی وہ روٹی بنا کر فارغ ہوئیں تو کچن کی کارنر والی کھڑکی سے عادتاً نیچے جھانکا اور چونک گئیں۔ کچن بیرونی سیڑھیوں کے پاس تھا۔ بالکل کارنر پہ... اس کی کھڑکی سے نیچے والوں کا صحن اور باہر کے گیٹ کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ حتیٰ کہ روڈ بھی اور راہ گیر بھی...

نیچے گیٹ کے اندرونی طرف انہیں ہارون دکھائی دیا تھا اور اس کے ساتھ باتیں بگھارتی ثانی بھی... کتنا مکمل اور بھرپور منظر تھا۔ اگر زیب بھی دیکھ لیتا تو...؟

ہارون اور ثانی... ثانی اور ہارون... ان کے ذہن میں کچھ فسانے تراشے جانے لگے تھے۔ وہ کچھ پل کے لیے کھڑی سوچتی رہیں۔ پھر کھڑکی سے ہٹ کر لاؤنج میں آئیں تو تازہ دم سا زیب کچن میں آتا دکھائی دیا تھا۔

اس کی طبیعت اب ٹھیک تھی اور خاصا فریش نظر آ رہا تھا۔ نائلہ نے کچھ پل کے لیے سوچا پھر جلدی سے بولیں۔

"طبیعت کچھ بہتر ہے تو کارنر سے اپنے ابو کے لیے بلڈ پریشر کی گولیاں پکڑ لاؤ۔ صبح سے مجھ سے کہہ رہے ہیں۔" نائلہ کے التجائیہ کہنے پہ زیب نے فوراً بائیک کی چابیاں اٹھائیں اور باہر نکلنے لگا۔

"کمال ہے امی! ابو کی دوائی میں لاپروائی نہ کیا کریں۔ آپ مجھے پہلے بتاتیں۔" وہ بولتا ہوا باہر نکلا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ نائلہ اس کے نکلتے ہی کچن کی کھڑکی میں جم کر کھڑی ہو گئیں۔ نیچے منظر کچھ بدل گیا تھا۔ ثانی اور ہارون اب باہر تھے۔ ثانی اس کے کندھے پہ دھپ لگاتی ہنس رہی تھی۔ پھر ہنستی ہوئی اس کی بائیک پہ بیٹھ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کتنا بھرپور منظر تھا۔ نائلہ کو مزہ آ گیا۔

زیب ابھی تک سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ شدید دھوپ میں... انتہائی گرمی... نائلہ کا دل بے چین ہو گیا۔ نائلہ مزید بیس منٹ انتظار کرنے کے بعد خود باہر نکل آئیں۔ وہ ماں کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ پھر اپنی لال انگارہ آنکھوں کو جھکاتا تیزی سے اندر چلا گیا۔ شاید اپنے کمرے میں۔

نائلہ بھی ہاتھ مسلتی اس کے لیے ٹھنڈا پانی لے کر جلدی سے پہنچ گئیں۔ وہ بستر پہ لیٹا ہوا تھا۔ بازو سے منہ کو ڈھانپے... نائلہ مضطرب سی اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

انہوں نے یہ ضرور چاہا تھا وہ ثانی کو ہارون کے اتنا قریب دیکھ لے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں چاہا تھا کہ وہ اس منظر کو خود پہ سوار کر لے۔

انہوں نے نرمی سے اس کا کندھا ہلایا۔ شاہ زیب چونک گیا اور پھر ماں کو اتنا قریب دیکھ کر سیدھا ہو بیٹھا۔ نائلہ بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے گہرا سانس بھرا اور دھیمی آواز میں کہنے لگیں۔

"تمہیں اس بات پہ غصہ یا دکھ ہے تو بڑا ہی عجیب غصہ اور دکھ ہے۔" نائلہ کے نرم لہجے اور گہرے الفاظ پہ زیب بے ساختہ چونک کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

"آج کچھ انوکھا یا نیا نہیں ہوا؟ جو تمہیں بہت عجیب لگا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ تم نے آج دیکھا اور تم ابھی تک شاک میں ہو۔" نائلہ نے کچھ دیر بعد سلسلہ

کلام وہیں سے جوڑا تھا۔

"یہ تو معمول کے منظر ہیں۔ ہارون کی نیچے والے ماموں سے گاڑھی چھنتی ہے۔ وہ ایک دن چھوڑ کے آ دھمکتا ہے۔ کبھی رات بھی رک جاتا ہے۔ یہ تو معمول کی باتیں ہیں۔" وہ بڑے ہلکے پھلکے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ زیب نے ایک مرتبہ پھر چونک کر لال آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ اگر وہ کہہ رہی تھیں تو ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ انہیں کیا ضرورت تھی مبالغہ آمیزی کی۔ شاہ زیب کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

"ثانی کی ہارون سے گاڑھی چھنتی ہے۔ ایسی بے تکلفی اور پیار ہے کہ حد نہیں.... اوپر چچا کے بھی تو بچے ہیں۔ مجال ہے جو کبھی کسی کو بلایا ہو۔ آواز تک دی ہو۔ یہ سمیر، رمیز تو خود ہی ڈھیٹوں کی طرح نیچے میچ دیکھنے چلے جاتے ہیں کہ پلازما ٹی وی پہ میچ کا اپنا ہی مزہ ہے۔ میں تو ہزار دفعہ منع کر چکی ہوں، مگر سنتے ہی نہیں۔ نیچے ثانی اتنا بڑبڑاتی ہے کہ گھر پھیلا کر چلے گئے۔"

زیب نے ان کی ساری تقریر سنی تھی۔ لیکن اس کا ذہن بس اسی بات میں اٹک گیا تھا۔ ایسی بے تکلفی اور "پیار" ہے کہ حد نہیں۔ اس کا ذہن لفظ "پیار" پر جیسے جم گیا تھا۔

اس کی شیشے جیسی آنکھوں سے کانچ ترخنے لگی کنپٹیوں میں لہو جیسے جوش مار رہا تھا۔

"ہارون نکمے کو بھی کوئی کام نہیں.... باوا کا چلتا بزنس ہے۔ خود اکلوتا.... کیا ضرورت ہے کسی کی چاکری کرنے کی.... ادھر بڑے ماموں کے چرنوں میں بیٹھ کر دعائیں لیتا ہے۔ ایک ٹکٹ میں کئی مزے...."

شاہ زیب کی برداشت بھی جیسے تمام ہو چکی تھی۔

"تو ہماری طرف سے جہنم میں جائیں۔ ہارون بچپن سے کمینہ ہے۔ اب بھی کمینگی ہی دکھائے گا۔" اس کا لہجہ آنچ دیتا تھا۔ نائلہ کو دلی سکون ملا تھا۔

"ہاں تو دفع کرو۔ ویسے بھی تمہاری پھوپھو کی بڑی لاڈلی بھتیجی ہے ثانی.... ہاتھ سے کہاں نکلنے دیں گے۔ ثانی کو ماں 'بیٹا.... خیر چھوڑو۔ اب آؤ' تمہارے بھائی انتظار کر رہے ہیں کھانے پہ۔ جن لوگوں کو ہماری پروا نہیں.... ہم ان لوگوں کی پروا کیوں کریں۔" وہ پیار سے اسے سمجھاتی اپنی جگہ سے اٹھیں تو زیب بھی خون کے گھونٹ بھرتا بظاہر خود کو نارمل ظاہر کر کے اٹھ گیا تھا۔

"آپ چلیں.... میں منہ ہاتھ دھو کے آتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد اس نے اتنا ہی کہا تھا اور پھر واش روم کی طرف چلا گیا۔ نائلہ نے مسکرا کر اس کی پشت کو دیکھا اور مطمئن ہو کر باہر نکل گئیں۔ آج کے دن کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کو نسبتاً موسم بہت خوش گوار تھا۔ شاید کہیں دور دراز کے علاقوں میں بارش ہوئی تھی۔ تب ہی ہوائیں ٹھنڈی اور نم تھیں۔ گرمی کا زور بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر تک اپنے دفتری کام میں مصروف رہا۔ پھر سمیر، رمیز کے پکارنے پہ اسے باہر آنا ہی پڑا تھا۔ حسن، احسن اور رمیز، سمیر کرکٹ میچ کھیل رہے تھے۔ نیچے تایا کے صحن میں.... صحن چھوٹا تھا، پھر بھی شوق کا کوئی مول ہوتا ہے بھلا؟

وہ ٹیرس کی ریلنگ پہ کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آواز لگا کر جیسے انہیں تنبیہ کی تھی۔

"تایا اور ان کی دختر کا پتا ہے۔ کیوں موت کو آواز دیتے ہو۔ اوپر آجاؤ۔ شطرنج کی بازی لگاتے ہیں۔" لیکن ان پہ آج کرکٹ کا بھوت سوار تھا۔ انہوں نے اس کی ایک نہیں سنی۔

"تایا اور ثانی آپا کو ہارون بھائی اپنے گھر لے گئے ہیں۔ وہ رات سے پہلے نہیں آئیں گے۔" نیچے سے سمیر نے اطلاع پہنچائی تھی۔ شاہ زیب جیسے سر ہلاتے ہوئے چونک گیا تھا۔

"اچھا.... تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔" اس کے اندر تنفر کی تیز لہر اٹھی تھی۔ جسے دباتا وہ تیزی سے اندر چلا گیا تھا۔ آنکھوں میں سرخی، چہرہ لال اور عجیب سے تاثرات.... وہ کھولتا ہوا اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ جب ابو نے اسے آواز دے کر بلا لیا۔

"کبھی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔ ایک تمہیں ماں پیاری ہے اور دوسرا اپنا کمرہ۔" ابو کے اپنے ہی بے حساب شکوے تھے۔ شاہ زیب چونک گیا۔ پھر سر جھٹکا کر ان کے قریب آگیا۔ وہ اپنی وہیل چیئر پہ بیٹھے تھے۔ کھڑکی کے سامنے۔ باہر سے تازہ ہوا آرہی تھی اور نیچے سے شور بھی.... زیب نے گہرا سانس بھرا.... اب وہ ابو کے غوری میزائلوں کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔

"کہاں ہوتے ہو شاہ زیب! ایسی بھی کیا مصروفیت۔ صبح دیکھوں تو تم گھر نہیں اور رات کو کیا دیکھوں؟ پتا نہیں کب آتے ہو۔" اب وہ موڈ بگاڑے پوچھ رہے تھے۔ زیب نے گہرا سانس بھرا تھا۔

"صبح میں جلدی دفتر کے لیے نکل جاتا ہوں۔ ایئر پورٹ ہمارے گھر سے بہت دور ہے اس لیے۔ رات کو دیر سے آتا ہوں۔ آپ تب تک سو چکے ہوتے ہیں۔ اتوار کو آپ کا ویکلی چیک اپ' دوائیاں' ٹیسٹ' ایکسرسائز.... پھر سودا سلف لانا۔ ہفتے بھر کے جمع شدہ کام اتوار کے دن کرنے ہوتے ہیں۔ آپ کو پتا تو ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولتا بولتا جانے کیوں تلخ ہو رہا تھا۔

"میں یہ ہی تو کہہ رہا ہوں۔ اتوار کے اتوار تم میرے ساتھ مصروف ہوتے ہو۔ کبھی تمہیں خیال آیا۔ میرے جیسا' بیمار' مریض میرا ایک بھائی بھی ہے نیچے اسے بھی تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارے باپ جیسا تمہارا تایا؟ ان کا تو بیٹا بھی کوئی نہیں۔" انہوں نے اچانک گفتگو کو اور سمت موڑا تھا۔ شاہ زیب ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔ وہ بات کو تایا کی طرف لے جائیں گے۔

"ان کا بیٹا نہیں' لیکن بھانجا تو ہے نا؟" جانے کیوں وہ اندر تک سلگ گیا تھا۔ ابو نے گہری سانس اندر کو کھینچی تھی۔ وہ وہیل چیئر کی ہتھیوں پہ ہاتھ جما کر بیٹھے تھے۔

"بھانجا ہے اور ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اتنی دور سے آجاتا ہے۔ بھتیجا کیوں نہیں؟ اتنا قریب رہ کر بھی.... تم گھڑی بھر کے لیے بھی وقت نہیں نکال سکتے' جبکہ ہارون....؟" ابھی وہ کچھ اور بھی بولنا چاہتے تھے لیکن شاہ زیب نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا تھا۔

"وہ نکما ہے' فارغ.... اسے کوئی کام نہیں۔ باپ کی کمائی اس کی نسلوں کے لیے کافی ہے' تب ہی وہ خدمت گزاری کے لیے آجاتا ہے۔ جبکہ میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ جو دوسروں کی جی حضوری میں صرف کروں۔" وہ اتنے تلخ لہجے میں بولا کہ ابو ہکا بکا رہ گئے تھے۔ اس کے انداز میں کاٹ دار قسم کی اجنبیت تھی۔

"وہ تمہارے تایا ہیں۔ کوئی دوسرے نہیں۔ کاش' میں اتنا محتاج نہ ہوتا۔ اپنے بھائی کی خبر گیری ہی کر لیتا۔ نہ وہ اوپر آسکتے ہیں اور نہ میں نیچے.... جب کبھی ڈاکٹر پاس جاؤں تو گھڑی دو گھڑی کے لیے ان کی صورت دیکھتا ہوں۔" انہوں نے بے حد رنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ.... اپنی پروموشن کی خبر دے آتے۔ اتنی سی بات پہ بھائی جان نے خوش ہو جانا تھا۔" ابو کے مزید شکوؤں پہ زیب نے گہرا سانس بھرا تھا۔ وہ تو سمجھا تھا۔ شاید کلاس ختم ہوگئی ہے مگر....

"امی مٹھائی لے کر گئی تو تھیں۔" اس نے جز بز ہو کر کہا۔

"تم خود کیوں نہیں گئے مٹھائی لے کر؟"

"امی جو چلی گئی تھیں۔ یہ کم تھا کیا؟ پھر نیچے سے کسی کو توفیق ہوئی اوپر آنے کی؟ اوپر آنا تو دور کی بات ہے۔ نشاۃ الثانیہ صاحبہ نے امی کو رسماً بھی مبارک باد نہیں دی۔ ایسی بھی کیا اکڑ؟" زیب نے سلگ کر جواب دیا تھا۔ ابو اس کا سرخ چہرہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

"مصروف ہوگی' تب ہی نہیں آئی۔" انہوں نے بودا سا بھتیجی کا دفاع کیا تھا۔ وہ کاٹ دار انداز میں انہیں دیکھتا رہا۔

"رہنے دیں ابو! ویسے سارے زمانے میں مٹر گشت کرتی ہیں۔ اوپر دریا بہہ رہا تھا۔ بیچ میں خلیج فارس تھی۔" وہ زیر لب تلخی سے بڑبڑایا تھا۔ باپ کو ثانی کی تفریحات کے بارے میں بتا نہیں سکا تھا۔ ہارون کے

ساتھ سیر سپاٹوں کے لیے بڑا وقت تھا۔ اوپر آتے ہوئے جان نکلتی تھی۔

"اور آپ اس کی بے جا حمایت نہ کریں۔ آپ جانتے تو ہیں۔ تایا اور ان کی بیٹی امی کے بارے میں کیسے خیالات رکھتے ہیں۔" اس نے جیسے بات ختم کرنا چاہی تھی، لیکن بات اس طرح ختم کیسے ہو سکتی تھی۔ ابو پریشانی سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ کس قدر کبیدہ خاطر تھا اور کس قدر بھائی جان سے متنفر نظر آرہا تھا۔ انہیں لگا سالوں پہلے جوان کے ایک انتہائی قدم کی وجہ سے ساری گتھیاں الجھ گئی تھیں آج بھی اسی طرح الجھی ہوئی تھیں۔ دلوں کی یہ کدورت کئی طریقوں سے نفرت میں ڈھل رہی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس ــــ کا انہیں کوئی سدباب کرنا تھا۔ مگر کیسے؟ شاہ زیب اٹھ کر جانے لگا تو نیچے سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ ساتھ ہی فضول سا شور' لگتا تھا گیند لگنے سے کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ شاہ زیب سر پہ ہاتھ مارتا تیزی سے باہر نکلا۔ نیچے والوں کا نقصان ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایک خوش گوار سی شام کے بعد پھوپھو کے ہاتھ کا مزے دار کھانا کھایا تو عرصے بعد کھانے کا مزہ آگیا تھا۔

ڈیڈی بھی بہت خوش لگ رہے تھے۔ پھوپھو کے گھر آکر ان کا مزاج اچھا ہو جاتا تھا۔ پھر ہارون اپنے ہاتھ سے گرین ٹی بنا لایا۔ اس نے ٹرے میں سے کپ اٹھا کر ہارون کو چھیڑا۔

"یہ زنانہ سے کام کرتے ذرا بھی اچھے نہیں لگتے تم۔ یوں لگتا ہے شیف گلزار کے چھوٹے بھائی ہو۔"

ہارون جو بڑے ہی موڈ میں راکنگ چیئر پہ بیٹھا تھا۔ اس "اعزاز" پہ تھرا ہی اٹھا۔ یعنی کہ شیف گلزار! اس کی جان ہی جل گئی تھی۔

"جب تمہارے گھر کے کچن میں آدھا کام کروا تا ہوں۔ کپڑے دھوتی ہو تو الگنی پہ ڈالتا ہوں۔ تب زنانہ ٹائپ نہیں لگتا؟ اب کچھ زیادہ لگ رہا ہوں۔" اس نے دوبدو چڑ کر جواب دیا تھا۔ ثانی اسے غور سے دیکھنے لگی تھی۔ وہ اچھا تھا۔ ناکس اور ہمدرد۔۔۔ خاص طور پر اس کا دل بہت اچھا تھا۔ خوش شکل اور خوش مزاج۔ یہ اس کی اضافی خوبیاں تھیں۔

"ایسے کیا گھور گھور کے دیکھ رہی ہو؟ مجھ پہ ڈورے ڈالنے کا ارادہ تو نہیں۔" ثانی نے اسے ایسے گھورا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"مجھ پہ ابھی اتنے بھی برے دن نہیں آئے۔" اس نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

"تم میں اتنی خوبیاں ہوتیں تو اور کیا چاہیے تھا؟ تم تو میری ناک بھی کٹوانے والی ہو۔ میری کزن ہو کر ایسی بزدلی۔۔۔" وہ بہت طریقے سے بات کو گھما کر وہیں لے گیا۔

"تو پھر کیا کروں؟ مجھے یہ لچھن نہیں آتے۔۔۔ اور جسے بیٹھا ہوا کوئی نظر نہ آئے اسے کھڑا ہو کر دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ کہ دیکھو، ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔۔۔ خدارا۔۔۔ ہم پہ نظر کرم کرو۔" ثانی نے شدید اذیت کی لہر دباتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ہارون کچھ پل کے لیے چپ سا رہ گیا تھا۔ اس نے کتنی سچی بات کہی تھی۔

"یوں پھر کب تک چلے گا ثانی؟" ہارون شدید بے چینی کے عالم میں بولا تھا۔ ثانی خالی خالی نظروں سے ہرے بھرے لان کو دیکھتی رہی۔

"مامی کے ارادے اچھے نہیں۔ یہ جو نام نہاد رشتہ داری نبھا رہی ہیں نا۔ کبھی عید' شب رات پہ کوئی میٹھی چیز بھیجنے والی۔ یہ بھی عنقریب ختم ہو جائے گی۔" ہارون کا لہجہ گہرا' کاٹ دار' تلخ تھا۔ ثانی اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

"اور سب سے بڑی بات۔۔۔ اس لاٹ صاحب کے اندر کیسی خو بو آگئی ہے۔ انسان کو انسان نہیں سمجھتا۔ پاس سے گزر جائے گا' لیکن مخاطب نہیں کرے گا۔ جیسے میں نے تو اس کی بھینس چرائی ہو۔" ہارون کو زیب پر بہت ہی غصہ تھا اور اب وہ اپنا غصہ نکال رہا تھا۔

"اس سب کے پیچھے کوئی تو وجہ ہے۔" ثانی نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"وجہ وہی ہماری عزت مآب ممانی جان....." وہ جل کر رہ گیا۔

"کیا خبر.... تمہاری ہونے والی ساس بن جائیں۔ کچھ عزت کرلیا کرو۔" ثانی ماحول پہ چھائی کثافت کم کرنے کے لیے ہلکے پھلکے لہجے میں اسے چھیڑ رہی تھی۔ ہارون کے چہرے پہ حسرت چھا گئی۔

"اپنے ایسے نصیب کہاں؟ وہ تو اپنے لاڈلے کی ہی ساس پلس ماں بننا چاہتی ہیں۔" اس کا انداز کھولتا ہوا تھا۔ اس کے جلے کٹے الفاظ پہ ثانی ہنسنے لگی تھی۔

ان دونوں کی باتوں سے قطع نظر پھوپھو نے ڈیڈی کو گھیر رکھا تھا۔ ہارون فون سننے کے لیے اٹھا تو ثانی کا دھیان ان کی باتوں بلکہ سنجیدہ ترین گفتگو میں اٹک گیا تھا۔

پھوپھو' ڈیڈی سے کہہ رہی تھیں۔ "میں کہتی ہوں۔ بات کو کسی کنارے سے لگاؤ۔ ضمیر سے دوٹوک بات کرو۔" پھوپھو کا انداز دوٹوک تھا۔ اٹل اور فیصلہ کن.....

"خود سے کیا بات کروں؟ بیٹی کا باپ ہوں۔ شرم سی آتی ہے۔ ضمیر کو خود سے خیال نہیں۔ اتنے سالوں سے اس کے بیٹے کا نام پہ میں نے اپنی بیٹی کو بٹھا رکھا ہے۔ اب جبکہ اس کے حالات بہتر ہیں۔ زیب اپنے پیروں پہ کھڑا ہے۔ لیکن وہ لوگ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ گئے ہیں۔" ڈیڈی کے چہرے پہ برسوں کی تھکن اتر آئی تھی۔ ثانی کا دل بھی بھر آیا۔ اس کا باپ کس قدر بے بس تھا۔ بلکہ اس مقام پر ہر باپ ہی اتنا بے بس ہو جاتا ہے۔

"مجھے نائلہ کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔ ضمیر سے کھل کے بات کرو۔ ہماری بچی گری پڑی تو نہیں..... میں تو خود اپنے ہارون کے لیے..... اگر ثانی کا رشتہ بچپن سے طے نہ ہوتا۔ بلکہ زیب کی مرحومہ ماں اپنی بھانجی سے طے کرکے نہ جاتی تو میں ثانی کو کبھی نہ جانے دیتی۔" پھوپھو ہاتھ مل رہی تھیں۔ ثانی انہیں بہت عزیز تھی۔

"میں سوچتا ہوں کچھ..... اور کتنا انتظار کروں؟ میں بیمار آدمی ہوں۔ اپنی بچی کا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔" ڈیڈی نے کہا تھا۔ پھوپھو نے ان کی تائید کی تھی۔

"میں خود بھی کروں گی۔ آتی ہوں کسی دن۔ زیب کو مبارک باد بھی دینی ہے۔ ماشاء اللہ سے کامیابیوں پہ کامیابیاں حاصل کر رہا ہے۔" بھتیجے کے لیے پھوپھو کے لہجے میں محبت امڈ آئی تھی۔ ثانی سے مزید کچھ سنا نہیں گیا تھا۔ دل ایک دم بوجھل ہو گیا تھا۔ ڈیڈی اور پھوپھو کی باتیں جس حد تک بھی صحیح تھیں۔ زیب سے محبت چاہے جس حد تک بھی تھی۔ اپنی ذات کی بے قدری کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا' وہ ڈیڈی کو اس بات سے باز ہی رکھے گی۔

☆ ☆ ☆

پھوپھو کے گھر میں ایک اچھا دن گزارنے سے طبیعت کا بوجھل پن کچھ کم ہی ہو گیا تھا۔ پھر ہارون اپنی گاڑی پہ انہیں گھر ڈراپ کر گیا۔

ثانی جیسے ہی اندر آئی' ڈیڈی کو ڈرائنگ روم کی گلاس وال کے سامنے کھڑا دیکھ کر چونک گئی تھی۔ پھر جیسے ہی اس کی نگاہ وال تک گئی اس کے مانو پسینے چھوٹ گئے تھے۔ وال کا آدھا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ اندر اتنا بڑا سوراخ تھا کہ سامنے والا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ نیا نکور شیشہ چکنا چور پڑا تھا۔

ابھی تو وہ اچھا بھلا سب کچھ چھوڑ کر گئے تھے۔ کس نے یہ سب کیا؟ ثانی کا سلگتا دماغ ایک نکتے پہ جم گیا تھا۔ اس کی نگاہیں بے ساختہ اوپر کو اٹھی تھیں۔ وہیں ریلنگ پہ سمیر اور رمیز جھول رہے تھے۔ شاید گاڑی کی آواز سن کر آئے تھے۔ ثانی کی شعلہ بار نگاہوں کی تپش سے گھبرا کر فوراً" اندر غروب ہو گئے تھے اور ثانی ان کی کارستانی سمجھ چکی تھی۔ اسے بے تحاشا غصہ آیا تھا۔ ہمیشہ ڈیڈی کے سمجھانے پہ ثانی درگزر سے کام لیتی تھی' لیکن آج وہ ان کو معاف کرنے والی نہیں

تھی۔ ڈیڈی اس کا ارادہ بھانپ چکے تھے۔ وہ بے بسی سے ”ارے ارے“ کرتے رہ گئے۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی اور اب ثانی کی اوپر سے تیز تیز بولنے کی آواز آرہی تھی۔

”تمہارا گھر ہے یا اصطبل..... ڈنگروں کا باڑہ؟ یا کرکٹ گراؤنڈ؟ نہ کوئی تمیز ہے‘ نہ کوئی اخلاق..... گھر سے کہیں جاؤ تو یہ بے نتھے بیلوں کی طرح فوراً ”میدان خالی دیکھ کر“ نیچے بھاگ آتے ہیں۔“
وہ غصے کے عالم میں بہت اونچا بول رہی تھی۔ اتنا اونچا کہ ڈیڈی کو نیچے اختلاج قلب ہونے لگا تھا۔

”قیامت تو نہیں آگئی۔ شیشہ ہی ٹوٹا ہے۔ تم تو لڑنے مرنے پہ اتر آئی ہو۔ ذرا جو تمیز ہو۔“ نائلہ کے آگ لگاتے انداز نے ثانی کو اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔

”مجھ میں تو ذرا بھی تمیز نہیں۔ کیونکہ مجھے تمیز سکھانے والی تو مر گئی۔ لیکن آپ تو بہ فضل خدا حیات ہیں۔ آپ ان بچوں کو اتنا نہیں سمجھا سکتیں۔ کہ اتنا چھوٹا سا صحن پلے گراؤنڈ نہیں ہو سکتا۔ ہر دفعہ یہ لوگ کوئی نہ کوئی قیمتی چیز توڑ دیتے ہیں۔ گلاس وال توڑ دی۔ اتنا بڑا نقصان؟ اس کو کون پورا کرے گا؟“

وہ تیز لہجے میں بولتی اس بات سے ناواقف تھی کہ گھر میں اس وقت شاہ زیب بھی موجود تھا اور اس نے اپنے کانوں سے بہت کچھ سن لیا تھا۔ اسے باہر آنا ہی پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ثانی چپ ہو گئی تھی۔ نائلہ نے فوراً ”فائدہ اٹھایا تھا۔

”آؤ زیب! دیکھ لو اس لڑکی کی زبان‘ کہتی ہے‘ میں نے بچوں کو تمیز نہیں سکھائی۔ ایسی بدتمیز لڑکی؟ ایسی لمبی زبان..... بڑے چھوٹے کا کوئی لحاظ ہی نہیں۔“
نائلہ نے تو لمحوں میں رونا شروع کر دیا تھا۔ جیسے ثانی کی بدتمیزی نے انہیں بڑا دھچکا پہنچایا ہو۔ ثانی ہکا بکا رہ گئی تھی۔ کیونکہ شاہ زیب اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

”تمہیں اس لہجے میں میری ماں سے بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ تم ہوتی کون ہو امی کو یہ بتانے والی کہ انہوں نے اپنے بچوں کی اچھی تربیت نہیں کی۔“
شاہ زیب کا دھیما پر غصیلہ لہجہ..... ثانی کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا تھا۔ چاچی نے بات کو غلط رنگ دیا تھا تو بیٹے نے بھی اپنی مرضی کے معنی و مطالب نکال لیے تھے۔ شاہ زیب کا دوبدو بات کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ ثانی ہکلا سی گئی تھی۔ جبکہ نائلہ تو چمک ہی اٹھیں۔

”دیکھو..... دیکھو..... منہ پہ مکر رہی ہے۔ اللہ کیسی جھوٹی لڑکی ہے۔“ نائلہ کے واویلے پہ ثانی خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئی تھی۔

”مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔ میں تو صرف یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ سمیر‘ رمیز اب بچے نہیں ہیں۔ کھیلنے کے لیے پلے گراؤنڈ جایا کریں۔ آج گلاس وال توڑ ڈالی۔ کبھی کوئی گملا‘ کبھی گل دان‘ کبھی کوئی روشن دان..... ان کے نشانے پہ رہتا ہے۔ آئے دن نقصان کرتے ہیں۔ ہمارا کون ہے جو کاریگروں کے پیچھے بھاگے۔ ٹھیک کروائے۔ انہیں کچھ خیال کرنا چاہیے۔“
ثانی قدرے دھیمے لہجے میں بولتی جانے کے لیے مڑی ہی تھی جب پیچھے سے شاہ زیب کی سلگتی آواز سنائی دی۔ ”جو تمہارا نقصان ہوا ہے وہ پورا ہو جائے گا۔ لیکن آئندہ تم اس انداز میں میری ماں سے گفتگو کرنے سے پرہیز کرنا۔ ورنہ میں بہت بری طرح سے پیش آؤں گا۔“
شاہ زیب کے سخت لہجے اور الفاظ پہ ثانی نے سخت توہین محسوس کی تھی۔ اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں بھینچا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی تھی۔ اس حال میں کہ اس کے بے آواز آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

ہارون آیا تھا‘ اسے اتنا اداس دیکھا تو اس سے رہا

نہیں گیا۔ بس تفصیل پوچھنے کی غلطی کرلی تھی۔ پھر جو ثانی شروع ہوئی تو پھر چپ ہی نہ ہو سکی۔

"اب رو کیوں رہی ہو گلاس وال تو سیٹ ہو چکی۔ یہ مگرمچھ کے آنسو کیوں بہا رہی ہو۔" اس کا انداز ہلکا پھلکا سا تھا۔ وہ اسے چپ کروانا چاہتا تھا۔ ثانی کو اور بھی شدت سے رونا آگیا۔

"اسی بات کا تو رونا ہے۔ اس نے ٹھیک کروا دی اور جاتے جاتے باتیں بھی سنائیں کہ میں اٹھ کر تسلی کرلوں۔ کہیں پھر سے ان پہ الزام نہ دھر دوں۔" میں نے کوئی الزام نہیں دھرا تھا۔ بس اتنا کہا۔" وہ ایک ہی سانس میں روانی سے بولتی جارہی تھی' جب ہارون نے بے ساختہ ٹوک دیا تھا۔

"جو تم نے کہا تھا' وہ میں نے تین سو تیرہ مرتبہ سن لیا ہے۔ اب تو مجھے لفظ لفظ حفظ بھی ہو گیا۔ چاہو تو میں دہرا دیتا ہوں۔ تم زحمت نہ ہی کرو۔" ہارون کے کہنے پر وہ خفیف ہو گئی تھی۔

"اصل دکھ تمہیں زیب کے بی ہیویر پہ ہے' تو کسی حد تک وہ ٹھیک تھا۔ تمہارا ردعمل خاصا جارحانہ رہا۔ یہ بات آرام سے بھی کی جاسکتی تھی۔ جبکہ تم مامی کا مزاج بھی جانتی ہو۔" اب وہ اسے رسان سے سمجھا رہا تھا۔ ثانی سوں سوں کرتی، ہونق سی ہو گئی۔

"تو اب میں کیا کروں؟" اس کے انداز میں بلا کی معصومیت تھی۔

"سوری....." ہارون نے اطمینان سے کہا تھا۔ "تم اب سوری کرلو۔"

"مگر کیسے؟" وہ ہونق سی ہو گئی تھی۔

"اپنی اس پھینی ناک کو ایک طرف رکھ کے..... شاہ زیب سے سوری کرلو۔ اس طرح بات ختم ہو جائے گی اور اس کی کدورت بھی....." ہارون نے مشورہ دیا تھا۔ ثانی تذبذب کا شکار تھی۔ اوپر وہ جانا نہیں چاہتی تھی اور نیچے وہ آتا نہیں تھا۔

بھلا ہارون جیسا اعتماد وہ کہاں سے لے آتی؟ اس نے گہرا سانس کھینچا اور بے بسی سے صحن میں چکر کاٹنے لگی۔ کیا پتا شاہ زیب کسی بھی وقت نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے آجاتا۔ وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا لینا چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

سلونی شام دریچوں سے پھسلتی رات میں بدل رہی تھی۔ آسمان پہ جابجا ستارے چمک رہے تھے۔ کہیں درختوں کی اوٹ میں شام کے بعد لوٹ کر آنے والے پرندوں کا شور تھا۔

افرا اپنے ہی دھیان میں الگنی سے کپڑے اتارتے ٹھٹک گئی تھی۔ کوئی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر آرہا تھا۔ پھر جیسے ہی اس کی بالکونی پہ نظر پڑی۔ ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔

افرا گھبرا سی گئی۔ ہارون اندر جانے کے بجائے سیدھا بالکونی میں آگیا تھا۔ افرا نے رخ موڑ لیا تھا۔ یہ شوخ آنکھوں والا زیب کا کزن اسے بڑا ہی چھچھورا لگتا تھا۔

"آہم....." اس نے کھنکھارا اور سلام جھاڑا۔

"سلامتی ہو..... کیا حال احوال ہیں؟" وہ ایسے بول رہا تھا جیسے بڑا ہی پرانا دوستانہ ہو۔ افرا نے جواب نہیں دیا تھا۔ بلکہ رخ موڑے کپڑے اکٹھے کرتی رہی۔

"یہ یہاں کیوں آیا ہے؟" وہ زیرلب بڑبڑائی۔ اس بڑبڑاہٹ کا جواب اس کے اندر سے آیا تھا۔ بہت اندر سے 'دل کی گہرائیوں کے پار سے.....

"وہ تو ہمیشہ تمہاری طرف ہی آتا ہے۔ اسی طرف جہاں تم ہو۔" اس جواب پہ وہ ہراساں سی ہو گئی تھی۔ جبکہ ہارون اس کے تاثرات پڑھتا اندر ہی اندر محظوظ ہو رہا تھا۔

"اس خاموشی کو کیا سمجھوں؟ اک ادا یا بے زاری؟" وہ ریلنگ سے کمر ٹکا کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" افرا خفا خفا سی بولی تھی۔ "آپ ادھر کیوں آئے ہیں۔ پلیز اندر چلے جائیں۔ اگر زیب بھائی نے دیکھ لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔" اس نے انگلیاں

چیختے ہوئے کپڑوں کی پوری ڈھیری فرش پہ گرا دی تھی۔"

ہارون نے آگے بڑھ کے فرش پہ گرے کپڑے اٹھا کر چارپائی پہ رکھے اور پھر بڑے انداز سے بولا تھا۔

"میں تو چاہتا ہوں..... تمہارا زیب بھائی دیکھ ہی لے۔ کم از کم یہ بیل تو منڈھے چڑھے۔" ہارون کے معنی خیز لہجے پہ وہ پوری جان سے گھبرا گئی تھی۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ زیب بھائی کی خبر ہے؟ اور امی..... یعنی میری امی؟ وہ آپ کا قیمہ بنادیں گی۔"

مارے ہکلاہٹ کے وہ الٹا سیدھا بولتی ہارون کے دل میں سیدھا سیدھا چھید کر گئی تھی۔ وہ کراہ کر رہ گیا تھا۔

"تمہاری امی کا پتا ہے۔ وہ تو سالم نگلتی ہیں۔ قیمہ بنانے کا کیا تردد کریں گی اور رہی زیب بھائی کی بات تو اس سے میں نپٹ لوں گا۔ اپنی جان ہے وہ....." ہارون نے بے نیازی سے کہا تھا۔ وہ اس کی صورت تکنے لگی تھی۔ مارے حیرانی سے..... یہ اور بات تھی کہ زیادہ دیر اس کی شوخ نگاہوں کا مقابلہ نہیں کر سکی تھی۔

"اور وہ جان، آپ کی جان نکال لے گا۔" افزا نے جیسے ڈرانا چاہا تھا۔

"بھول ہے تمہاری..... ایسا نہیں ہوگا۔" ہارون نے لاپروائی سے کہا۔ پھر اچانک اس کے قریب آگیا۔ وہ دیوار سے لگ گئی تھی۔

"ایک بات بتاؤ افزا! جس چنگاری نے میرے اندر کی دنیا کو برزخ بنا رکھا ہے۔ اس کی تپش ابھی تک تمہارے اندر نہیں پہنچی؟" اس نے اچانک ہی آر یا پار کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن افزا..... وہ تو جیسے کرنٹ کھا کر اچھل پڑی تھی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" ہارون اندر تک سلگ گیا۔

"کچھ نہیں..... جھک مار رہا ہوں۔ اتنے عرصے سے..... تف ہے ہارون تجھ پہ۔"

افزا کے بدن میں جیسے جان ہی باقی نہیں رہی تھی۔ سینے سے لگے کپڑے ایک مرتبہ پھر سجدہ ریز تھے اور ہارون دھپ دھپ کرتا رخ پلٹ کر نیچے جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

لاؤنج میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ جب وہ کپڑوں کے ڈھیر کو سینے سے لگائے اندر آئی تو لاؤنج سے دھیمی دھیمی سی آوازیں آرہی تھیں۔ زیب گھر آچکا تھا۔ اس کے بھائی ٹیوشن پڑھنے گئے تھے۔ ابو شاید نماز پڑھ رہے تھے۔ سوامی اور زیب کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ یہ راز و نیاز بھری باتیں وہ دونوں ہی کرتے تھے۔ صلاح و مشورے، تبصرے اور تجزیے..... اس کا دل ابھی تک کانوں میں دھڑک رہا تھا اور ہتھیلیاں پر نم تھیں۔ ہارون کا چہرہ..... آنکھیں، انداز گفتار..... ایک ایک ادا۔ "اعلان محبت" کے لیے کافی تھی۔ اس صورت میں جبکہ اس کی آنکھیں شاہ زیب کے خواب بننے لگی تھیں اور اس کی امی سپنوں میں بھی اسے زیب کی دلہن بنے دیکھتی تھیں۔ اس صورت میں ہارون بھلا کن راہوں کی مسافرت اختیار کر رہا تھا؟ اسٹور روم کی طرف جاتے جاتے ٹھٹک گئی تھی۔ اسے امی کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔

"تم سوچ لو زیب! جو تمہارا باپ چاہتا ہے، وہ میری زندگی میں کبھی نہیں ہوگا۔ میں مر بھی جاؤں تب بھی نہیں....." امی کی آواز میں صاف دھمکی تھی۔ دھونس بھری دھمکی..... ان کے لہجے میں ایک مان تھا۔ وہ زیب کا جواب سننے کے لیے رک گئی تھی۔

"جو آپ چاہتی ہیں، ویسا ہی ہوگا۔ ابو کچھ نہیں کر سکتے۔" زیب کا انداز تسلی دینے والا تھا۔

"تمہارے ابو تیار بیٹھے ہیں۔ وہ ہر صورت رشتہ لے کر جانا چاہتے ہیں۔ میرے لاکھ سمجھانے پہ بھی..... بھائی جان اور ان کی بیٹی کے نخرے آسمانوں پہ ہیں۔ وہ ہمیں رشتہ نہیں دیں گے، بلکہ آج کل ہارون ان کے دماغوں پہ سوار ہے۔ تو پھر اپنی بات گنوانے کا فائدہ؟" اب وہ بات کو صاف دوسرے رنگ میں بدل رہی تھیں۔ شاہ زیب کچھ لمحہ کے لیے چپ رہ گیا تھا۔

"ابو سے میں خود بات کر لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔" کچھ دیر بعد وہ بمشکل بولا تھا۔

"وہ نہیں سنیں گے۔ انہوں نے مجھے دوٹوک کہہ دیا ہے۔ اپنی بھتیجی کی زبان درازی دیکھتے ہوئے بھی.... ابھی دو دن پہلے وہ میری گھر آکر اتنی بے عزتی کر گئی ہے۔ اتنی باتیں سنا گئی ہے۔ ابھی وہ ذرا احترام لحاظ نہیں کرتی۔ بعد میں تو جوتی کی نوک پہ رکھے گی۔" انہوں نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔ زیب پریشان ہوگیا۔ ماں کے آنسو اسے بے قرار کر رہے تھے۔

"جو آپ چاہیں گی' وہی ہوگا۔ آپ کو اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ اٹھ کر اندر جا رہا تھا۔ افزا جلدی سے کچن میں گھس گئی۔ امی ابھی تک لاؤنج میں تھیں۔ زیب اپنے کمرے میں چلا گیا تو افزا کچن سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری تھی۔ جسے ماں کے سامنے رکھتے ہوئے وہ خود بھی تخت پہ بیٹھ گئی تھی۔ نائلہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے کی رنگت کملائی سی تھی۔ پھیکا رنگ' اداس آنکھیں....

"کیا ہوا ہے افزا؟ باہر کوئی آیا تھا؟" انہوں نے محتاط انداز میں پوچھا افزا اندر سے گھبرا گئی تھی۔

"ہارون...." اس نے بمشکل ہی کہا تھا۔ نائلہ چونک گئیں۔

"وہ کیوں آیا تھا؟" نائلہ کی آنکھوں میں حیرت پھیلی۔ ان کے انداز میں ناگواری تھی۔ افزا نے نفی میں سر ہلایا۔

"پتا نہیں.... شاید زیب سے ملنے...."

"اچھا.... اچھا.... اب زیب کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی۔ زیب کو ان لوگوں سے دور ہی رہنا چاہیے۔" اب وہ اس معاملے کو مزید لٹکانا نہیں چاہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆
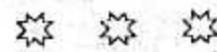
اگلی سویر بڑی پر تپش تھی۔ دھوپ بھری.... گرمی کا زور کچھ زیادہ ہی لگ رہا تھا۔ افزا نے صبح ہی صبح اٹھ کے صفائی کر لی تھی۔ نائلہ کچن میں ناشتا بنا رہی تھیں۔ بچے کالج' اسکولوں میں جا چکے تھے۔ زیب ابھی اپنے کمرے میں تیار ہو رہا تھا۔ آج اس نے ذرا دیر سے جانا تھا۔

جیسے ہی وہ کمرے سے تیار ہو کر باہر نکلا نائلہ بھی کچن سے ٹرے سجا کر برآمد ہوئی تھیں۔ زیب پہ نگاہ پڑی تو زیر لب ماشاءاللہ کہا تھا۔

معاً" ضمیر بھی اپنی وہیل چیئر گھسیٹتے باہر آگئے تھے۔ ہاتھ میں اخبار تھا۔ جسے انہوں نے رول بنا کر تخت پہ اچھال دیا تھا۔ زیب کچھ چونک گیا تھا۔ نائلہ نے زیب کے سامنے چھوٹی تپائی پہ ٹرے رکھی۔ وہ باپ کا انتظار کرنے لگا تھا' تاکہ اکٹھے ناشتا کرلیں' نائلہ نے بتایا۔

"ضمیر نے چائے لی ہے۔ ٹھہر کے ناشتا کریں گے۔ تم شروع کرو۔" نائلہ بھی قریب آکر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ ایک ٹک زیب کو دیکھ رہے تھے۔ جانے کیوں دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔ معاً" ضمیر نے گہرا سانس کھینچا اور گلا کھنکھار کے زیب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"زیبی! آج ذرا وقت پہ گھر آجانا.... اور واپسی پہ اچھی سی مٹھائی بھی لانا۔" ان کا انداز نرم تھا۔ نائلہ نے چونک کر شوہر کی طرف دیکھا تھا۔

"خیر تو ہے... کیوں... شوگر بڑھانے کا ارادہ ہے ابو!" زیب کا لہجہ ہلکا پھلکا تھا۔ ضمیر دھیمے سے مسکرا دیے۔

"بس یوں ہی.... دل چاہتا ہے کچھ ہلا گلا سا ہو.... زندگی پہ جمود سا طاری ہے۔"

"تو اس جمود کو توڑنا چاہتے ہیں۔ شوگر بڑھا کے' اپنے قل کروا کے' گیدرنگ تو ہو جائے گی' مگر آپ دیکھ نہیں پائیں گے۔" نائلہ نے اندر اٹھتے اضطراب کو بمشکل دباتے ہوئے بات کو اور رنگ دیا۔

"نہیں.... میں زیب کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ماشاءاللہ سے اپنے پیروں پہ کھڑا ہے۔ ہمارا اور اپنی بیوی' بچوں کا خرچا اٹھا سکتا ہے۔ دیر مناسب نہیں لگتی۔" ضمیر نے نرمی سے زیب کا چہرہ ٹٹولتے کہہ رہے تھے۔ اس کی خاموشی سے ضمیر کو ڈھارس سی پہنچی۔ اس نے انکار نہیں کیا تھا۔

"میں تو خود اس دن کے انتظار میں ہوں۔ اللہ یہ

مبارک دن لائے۔ میں اپنے بیٹے کو دولہا بنے دیکھوں۔" نائلہ نے سچائی کے ساتھ کہا تھا۔ ضمیر نے گہرا سانس اندر کو کھینچا تھا۔ وہ نائلہ کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"ہوں....." انہوں نے ہنکارا سا بھرا تھا۔ "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ تم آج مٹھائی لانا۔ میں نیچے جاؤں گا بھائی جی سے شادی کی تاریخ لینے۔ برسوں گزر گئے رشتے کو۔ اب اس معاملے کو تکمیل تک پہنچنا چاہیے۔"

ضمیر کے الفاظ نہیں تھے۔ کوئی بم تھا جو ان کے سروں پہ پھٹا تھا۔ نائلہ تو ایسے ہو گئیں جیسے برف کی کوئی سل ہو۔ ایسی ہی کیفیت زیب اور افزا کی تھی۔ افزا بھی ماں کی طرح کچن کے چوکھٹے میں ہی جامد ہو گئی تھی۔

"میں شادی کروں گا ابو..... ضرور کروں گا۔ لیکن ثانی کے ساتھ نہیں۔ یہ بات میں بار بار دہرانا نہیں چاہتا۔ بس پہلی اور آخری دفعہ کہہ رہا ہوں۔" زیب کے ٹھنڈے برف سے لہجے نے اب کی بار ابو کو برف بنا دیا۔ وہ ششدر سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔

زیب نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اب وہ ٹشو سے انگلیاں پونچھ رہا تھا۔ نائلہ جو لمحہ بہ لمحہ ریزہ ریزہ ہو رہی تھیں۔ زیب کے مضبوط لہجے پہ جیسے قطرہ قطرہ پھر سے جمع ہونے لگیں۔ ان کے حلق میں اٹکتی سانسیں بحال ہو رہی تھیں۔ یہ ہی حال دیوار سے لگی افزا کا بھی تھا۔

"ثانی سے نہیں..... تو کس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" بہت دیر بعد ابو نے کپکپاتی آواز میں پوچھا تھا۔ ان کا لہجہ زخمی تھا اور آواز کانپ رہی تھی۔

"کسی سے بھی..... کوئی بھی ہو..... بس نشاۃ الثانیہ صاحبہ نہ ہوں۔" اس کا لہجہ بلا کا کھردرا اور کاٹ دار تھا۔ اس کے چہرے پہ عجیب سی نفرت پھیل گئی تھی۔ ابو اس کا چہرہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

"اس انکار کی کوئی وجہ....." انہوں نے بہت دیر بعد لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا تھا۔ زیب کچھ پل کے لیے چپ رہا، پھر گہرا سانس کھینچ کر بولا۔

"ضروری نہیں کوئی وجہ ہو..... اگر ہو بھی تو ہر وجہ بتانے والی نہیں ہوتی۔ بس یوں سمجھ لیں، آپ کے بھائی صاحب بہت اونچے لوگ ہیں اور میں ان کے قابل نہیں۔" اس کا دوٹوک انداز انہیں بے چین کر گیا تھا۔ جبکہ نائلہ اب پرسکون تھیں۔

"شاہ زیب..... یہ نہیں ہو سکتا..... تم انکار نہیں کر سکتے۔ میرا بھائی ٹوٹ جائے گا۔ میرا خاندان ٹوٹ جائے گا اور تمہاری مرحومہ ماں کی یہ آخری خواہش تھی۔ تم مدحت کی آخری خواہش کو پورا نہیں کرو گے؟ تمہاری مرحومہ ماں کا خواب....." بولتے بولتے ابو کی آواز رندھ گئی تھی۔ جانے انہیں کیا کچھ یاد آگیا تھا۔ شاید اپنی زیادتیاں اور مدحت کا صبر۔ وہ سینہ مسلتے سخت بے چین تھے۔ زیب نے ایک طویل اور گہرا سانس لبوں سے برآمد کیا تھا۔ پھر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ پرسکون تھا۔

"میری مرحومہ ماں کے تو بہت سے خواب تھے۔ جو سب ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے۔ سارے خواب پورے نہیں ہوتے، یہ بھی نہ ہوا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" زیب کے اطمینان پہ نائلہ تک ششدر رہ گئی تھیں۔ دیوار سے لگی افزا بھی یک ٹک زیب کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی ماں بہت خوش تھی کہ زیب اس کے حسب منشا ڈٹ گیا ہے۔ لیکن جانے کیوں افزا کا دل کوئی مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا۔ اسے زیب کی آنکھوں میں ویرانی نظر آرہی تھی۔ یہ ویرانی اس کی ماں کو نظر نہیں آسکتی تھی۔ اس ویرانی کو محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے تھے۔ افزا کا دل قطرہ قطرہ پگھلنے لگا تھا۔

"میری بات مان لو زیب! تمہاری ماں کی روح کو بہت تکلیف پہنچے گی۔" ابو کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرنے لگی تھیں۔ زیب نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بھینچ لیں۔ پتلیوں کے اس پار بہت کچھ تھا۔ کچھ احساس، کچھ جذبے، کچھ محبت کے شگوفے، کچھ خواب، کچھ تمنائیں، کچھ چاہتیں، لیکن ضروری تو نہیں، ہمیں سب کچھ اسی زندگی میں میسر آجائے۔

"میری ماں جب زندگی کو موت سمجھ کر جی رہی تھی۔ اس کی روح کو تب بھی بہت تکلیف پہنچتی تھی۔ بس یہ تھا کہ اس وقت آپ کو ان کی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ اب ان کو کیا تکلیف پہنچے گی اب وہ ساری تکلیفوں سے بے نیاز ہو چکی ہیں۔" زیب کے لہجے میں چٹانوں سی سختی بھر گئی تھی۔

"تمہیں اس عورت نے متنفر کر رکھا ہے۔ تمہیں اپنی ماں کی آخری خواہش کا بھی احساس نہیں رہا۔" وہ جیسے حلق کے بل چلائے تھے۔ یوں کہ افزا کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہوئی تھی اور نائلہ کی رنگت فق ہو گئی تھی۔ انہوں نے آج ضمیر کا ایک اور ہی روپ دیکھا تھا۔

"تمہیں اس عورت نے ورغلا رکھا ہے۔ متنفر کر دیا ہے۔ یہ سازشی عورت....." جانے وہ غصے کی انتہا میں کیا کچھ کہنے والے تھے۔ ان کے الفاظ پہ زیب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا تھا۔

"یہ عورت آپ کی بیوی ہے۔ آپ اسے میری ماں پہ سوکن بنا کر لائے تھے۔ میری ماں اس صدمے سے مری یا بیماری کے غلبہ پانے سے.....؟ میں نے تو صرف انہیں اپنی ماں کے بعد بطور ماں قبول کیا تھا۔ آپ جو بھی سمجھیں.... بس آپ کی بھتیجی میری بیوی نہیں بن سکتی۔" وہ زہر خند سا بولتا چلا گیا تھا۔ ابو لمحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گئے تھے۔

"زیب!" ان کی رنگت اڑ گئی تھی یا شاید وہ سچائی کو برداشت نہیں کر سکے تھے۔

"ثانیہ تمہاری ماں کی سگی بھانجی ہے۔" اب کے ان کی آواز کپکپائی ہوئی تھی۔ انہیں اپنے کمزور لہجے پہ ترس آیا تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ بے نیاز تھا اس نے اٹھ کر موبائل اور لیپ ٹاپ اٹھایا۔ ابو نے بھیگی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھنا چاہا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے دھند آ رہی تھی۔

"تمہاری منگیتر ہے۔" ان کا لہجہ اور بھی کمزور تھا۔

"کبھی تھی....." اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔

"یہ رشتہ تمہاری مرضی سے ہوا تھا۔" وہ اسے کچھ یاد دلا رہے تھے۔

"کبھی ہوا تھا۔" زیب جیسے سب کچھ بھول چکا تھا۔ ایک ماضی تھا۔ جس کی قبر میں اس نے سب کچھ دفن کر دیا تھا۔ ابو اپنا سینہ مسلنے لگے۔

"ثانی تمہاری پسند تھی۔" وہ تھکنے لگے تھے۔ زیب آگے بڑھ رہا تھا۔

"کبھی تھی۔" وہ دروازے کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اب وہ دروازہ کھول رہا تھا۔ اسے ابو کی آواز پھر سے سنائی دی تھی۔ اس آواز میں بہت کچھ تھا۔ گئے دنوں کی یادیں۔ کچھ اچھی، کچھ بری اور ان کے پیچھے جھانکتی محبت.....

"ثانی تمہاری محبت تھی شاہ زیب!" انہوں نے وہیل چیئر کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور ان کے سفید بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

اس دفعہ شاہ زیب "کبھی تھی" کہہ کر آگے نہیں بڑھا تھا۔ کچھ تھا جس نے اسے روک لیا تھا۔ پھر اس نے گردن موڑ کر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پہ واضح شکستگی تھی۔ ایسی ہی شکستگی اور تھکن شاہ زیب کے چہرے پہ دھول کی مانند اڑ رہی تھی۔ افزا سے زیب کے چہرے پہ اتری تھکن دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگائے لگائے پلکیں سختی سے میچ لی تھیں۔ تب ہی دو آنسو بغاوت کرتے آنکھوں کے کناروں سے ٹوٹ کر گر پڑے تھے۔ آج وہ عمر بھر کے لیے مفلس ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

درختوں کی دو رویہ قطار تلے ذیلی سڑک تھی۔ گھنی چھاؤں سے ڈھکی یہ سڑک بہت ٹھنڈی تھی۔ جس کے اوپر چرمرے پتے جگہ جگہ گرے پڑے تھے۔ شاید تیز ہوا سے جھڑے تھے۔ وہ ان پتوں کو جوتوں تلے روندتا چل رہا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اسے آج کیا کچھ نہیں یاد آرہا تھا۔ وہ سب کچھ جو کبھی بھولا نہیں تھا۔ بھولنے والا ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی ماں کی بیماری اور پھر اس کا تڑپ تڑپ کر مرجانا۔
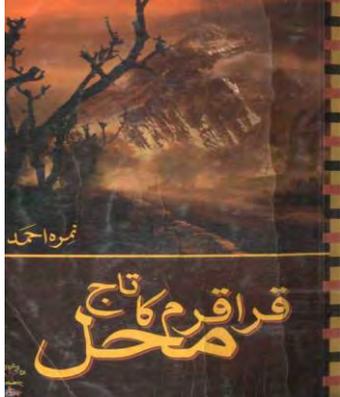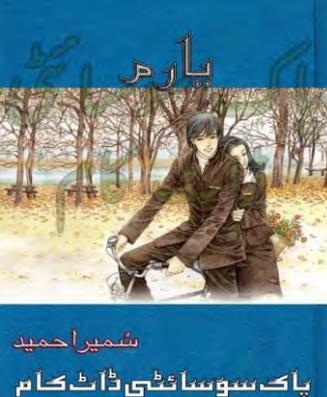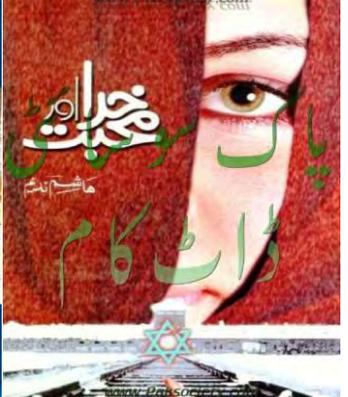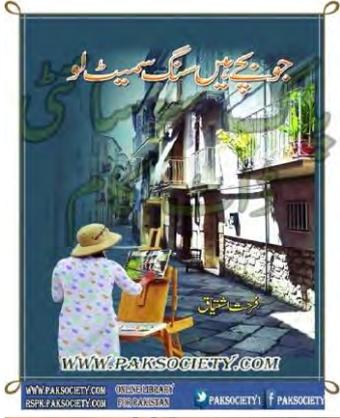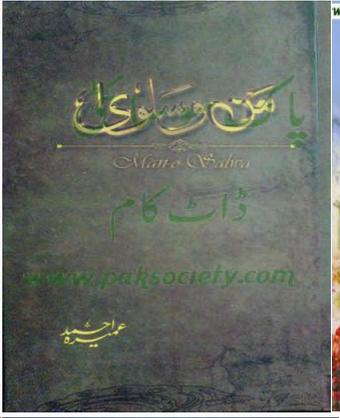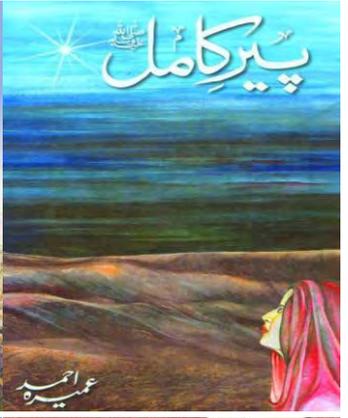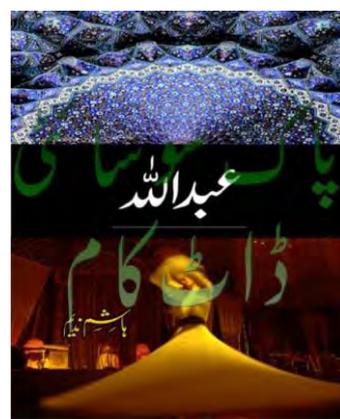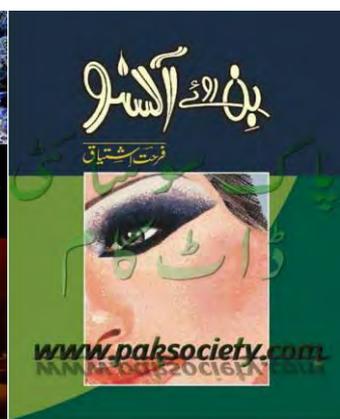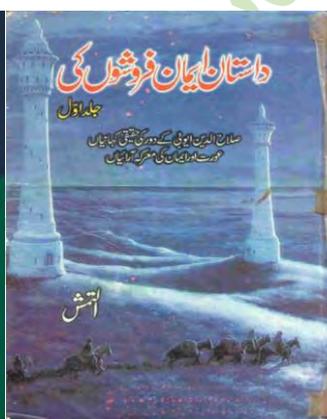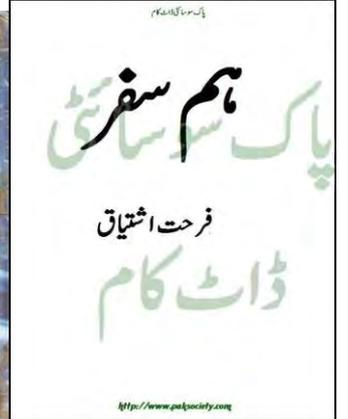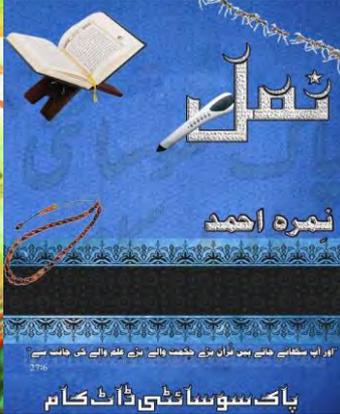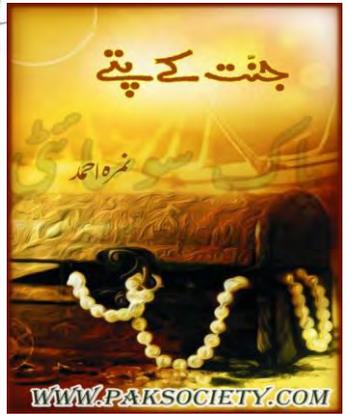
لیکن پھر بھی زیب نے سب کچھ بھلا دیا۔ زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے.... زندہ رہنے کے لیے.... جینے کے لیے.... کچھ رشتوں کو بچانے کے لیے....

وہ چلتا چلتا رک گیا تھا۔ پھر قریب ہی لکڑی سے بنے ایک اونچے چوکور بینچ پہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے، بہت پرانے منظر عکس سے تصویر بننے لگے تھے اور اس تصویر کے اندر ایک نیا چہرہ تھا۔ شگفتہ، تروتازہ اور خوب صورت، ایک ایسا دلکش چہرہ جسے دیکھ کر اس کی ماں کے چہرے پہ موت کی سی مردنی چھا گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے کناروں کو بھیگتا سا محسوس کیا۔ اس کا ذہن بہت پیچھے چلا گیا تھا۔

وہ خزاں کے دن تھے۔ ایسے ہی درختوں کے پتے، جھڑ جھڑ کر گرتے اور سڑکوں کو ڈھانپ لیتے تھے۔ وہ پتوں سے بھری سڑک پہ پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں کتابوں کا تھیلا تھا۔ وہ بہت سست قدموں سے چل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گھر جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔

وہ گھر جس میں زیب کا ٹھکانا تھا۔ وہ اس کے باپ کا گھر نہیں، بلکہ تایا کیپٹن خضر حیات کا گھر تھا۔ زیب کے ابو کی اچھی بھلی جاب اچانک ختم ہوگئی تھی۔ اس کی امی بدحت بیمار تھیں۔ ابو کی نوکری ختم ہوگئی تو ان کے گھر کا نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ زیب کی پڑھائی تک چھوٹ گئی تھی۔ مالک مکان نے ایک سال تک کرایہ نہ دینے کی وجہ سے انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ تب اس کی خالہ فرحت جو اس کی تائی بھی تھیں، انہیں اپنے گھر ہمیشہ کے لیے لے آئی تھیں۔ ابو تب بھی بے روزگار ہی تھے۔ تائی نے ان کے گھر کا خرچا بھی اٹھا لیا تھا۔ زیب کا اسکول بھی شروع ہوگیا اور مالک مکان کے عنایت سے بھی جان چھوٹ گئی تھی۔ کسی حد تک زندگی میں سکون آگیا تھا۔

ابو اور تایا میں بہت محبت تھی تو تائی اور امی میں بھی بڑا پیار تھا۔ اسے یاد تھا۔ اس کے گھر اوپر کم ہی کھانا پکتا تھا۔ تائی ہمیشہ کھانا بنا کر اوپر بھیج دیتی تھیں۔ زیب کو تب نہیں پتا تھا کہ اس کی بھاری فیس، گھر کے اخراجات اور امی کی دوائیوں کا خرچا کون اٹھاتا ہے۔

بس یہ سب کام جن پر ان کے گھر میں ہمیشہ لڑائی ہوتی تھی، خود بخود سرانجام پا جاتے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔

تایا کے گھر میں آجانے کے بعد زندگی میں ایک ٹھہراؤ آگیا تھا۔ ابو کی امی سے لڑائیاں کم ہوگئی تھیں۔ اب وہ امی کو بیماری کے اتنے طعنے نہیں دیتے تھے۔ گھر کے خرچے پہ بھی تکرار نہیں ہوتی تھی۔

زیب تھوڑا بڑا ہوا تو اسے اندازہ ہوا تھا۔ اس کی شفیق تائی کی بدولت بہت سارے معاملات خاموشی کے ساتھ طے پا جاتے تھے۔ تائی کو اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔ اسی طرح امی کو اپنی اکلوتی بھابھی سے بڑا پیار تھا۔ زندگی میں ایک روانی تھی۔ ایک سکون تھا۔ امی نے ثانی کو زیب کے لیے بہت بچپن میں ہی مانگ لیا تھا۔ لیکن یہ رشتہ بہت ساری بدگمانیوں اور رنجشوں تلے دب گیا تھا۔ ایک ایسی آندھی اٹھی تھی جو زیب کے گھر کو تنکا تنکا بکھیر گئی تھی۔

اس کے ابو نے فیکٹری میں اپنے ساتھ ملازمت کرتی ایک طرح دار، خوب صورت لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ نہ صرف اس سے نکاح کرلیا تھا، بلکہ اسے اپنے ساتھ گھر میں بھی لے آئے تھے۔ اس کی بیمار ماں پہ ستم ڈھانے کے لیے....

یہ ایک قیامت تھی، جو آئی اور ٹھہر گئی۔ ابو کی دیدہ دلیری، امی کی خاموشی، نیچے تائی اور تایا کا بانگ دہل نفرت اور لاتعلقی کا اعلان.... نیچے والوں نے ابو کی دوسری شادی کو کسی طور قبول نہیں کیا تھا۔ تائی ابو کو کسی بھی طور معاف کرنے پہ تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے اوپر آنا چھوڑ دیا اور اپنا دست شفقت ان کے گھرانے سے اٹھا لیا تھا۔

کچھ عرصہ اسی لاتعلقی کے درمیان گزر گیا۔ تائی کی آمدورفت کم ہوئی تو اوپر نائلہ نے اپنا سکہ جمالیا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنی بیٹی افزا کو بھی اپنے ساتھ گھر لے آئی۔ افزا اس کے پہلے شوہر سے اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی امی نائلہ کی اجارہ داری بڑھتے دیکھ کر خود بخود پیچھے ہٹ گئی تھیں لیکن اس کی خالہ نے جو تائی بھی تھیں نائلہ کے ساتھ کھلم کھلا "لڑائی" کا اعلان کردیا تھا۔ وہ انہیں اپنے گھر سے بھی نکالنا چاہتی تھیں اور یہ ایک انتہائی فیصلہ تھا۔

نائلہ کو گھر سے نکالنے کا مطلب یہ تھا کہ زیب کا بھی اس گھر سے چلے جانا... ابو اور امی کا بھی نکل جانا... لیکن تائی، امی اور زیب کو روکنا چاہتی تھیں۔ یہ حکم بس نائلہ اور اس کی بیٹی افزا کے لیے تھا۔ لیکن جب ابو نے سنا تو ایک قیامت برپا ہوگئی تھی۔ ابو نے بہانگ دہل اعلان کردیا تھا۔

"اگر نائلہ اس گھر میں نہیں رہے گی تو وہ اور زیب بھی یہاں سے چلے جائیں گے۔ مدحت اکیلی بہن کے چرنوں میں رہیں۔"

ابو کے اس ظالمانہ فیصلے نے امی کو اندر سے بالکل توڑ دیا تھا۔ ان کی رہی سہی امیدیں بھی ختم ہوگئی تھیں۔ نائلہ کی محبت کا جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ ابو کو نائلہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ادھر تائی اپنے فیصلے سے ہٹنے پہ تیار نہیں تھیں۔

یوں ایک دن ابو نے نائلہ، افزا اور شاہ زیب کو لیا اور تایا خضر حیات کا مکان ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ اس صورت میں کہ زیب کی بیمار ماں اسی گھر میں بے یارومددگار اکیلی رہ گئیں۔ شوہر اور بیٹے کی جدائی کا لامحدود غم سینے سے لگا کر...

یہ چھوٹا سا ایک کمرے کا مکان تھا۔ انتہائی غلیظ علاقے میں۔ بہت گندا، پرانا اور جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا۔ بارش آتی تو چھت سے ٹپک ٹپک کر سیلاب آجاتا تھا۔ گلیوں میں پانی کھڑا ہوجاتا۔ ابو کی محدود آمدن میں اس مکان سے بہتر ٹھکانا ملنا بہت مشکل تھا۔ چار افراد کھانے والے، جن میں ایک دو سال بعد مزید اضافہ ہوتا گیا تھا۔

یوں کچھ عرصہ کھینچ تان کے وقت بمشکل گزرا اور ایک دن تایا ان کے لیے دوبارہ زندگی کا پیغام لے کر آگئے تھے۔ تایا کی آمد ان کی گھٹن زدہ زندگیوں میں بہار کا ایک جھونکا ثابت ہوئی تھی۔ تایا، ابو کو لینے آئے تھے۔ امی کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ زیب سے ملنا چاہتی تھیں۔ تائی نے بھی سینے پر پتھر رکھ کر ایک مرتبہ پھر اپنے گھر کے دروازے ان کے لیے کھول دیے تھے۔ لیکن وہ اپنے دل کے دروازے آنے والے کئی سال تک کھول نہیں سکی تھیں۔

ان کی آمد کے ساتھ ہی امی کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا تھا۔ وہ شاید زیب سے ملنے کے انتظار میں تھیں۔ اسے دیکھ لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ زیب کے لیے ماں کی دائمی جدائی ایک نہ ختم ہونے والے مسلسل درد کی صورت اختیار کرگئی تھی۔ ماں کی موت کا ذمہ دار کون تھا۔ ابو؟ حالات؟ وقت؟ یا ابو کی دوسری شادی؟ زیب نے کسی بھی صورت میں اپنی سوچوں کو منفی نہ ہونے دیا۔

جس طرح سوتیلی ماں کو قبول کرلیا تھا۔ اسی طرح ماں کی موت کو بھی قبول کرلیا۔ بس وہ پہلے سے زیادہ خاموش ہوگیا تھا۔ گزرتے وقت نے نائلہ کو زیب سے بے انتہا قریب کردیا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی۔ امی کی موت کے بعد نائلہ کے اندر بڑی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اب وہ پہلے کی طرح اکڑ اور خودی میں نہیں رہتی تھی۔ گو کہ زیب کے ساتھ اس کا رویہ پہلے بھی بہت اچھا تھا۔ لیکن اب اس کا رویہ بے انتہا اچھا ہوگیا تھا۔ حقیقی معنوں میں نائلہ نے زیب کو سگی ماں سے بڑھ کر چاہت اور محبت دی تھی۔ شاید اس نے دل

✡ ✡ ✡

سبک رفتاری سے گزرتے وہ دن زیب کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھے۔ وہ اپنی امی کی یاد کو سینے سے لگا کر رات بھر تکیے میں منہ دے کر روتا تھا۔ اسے اس گھر میں ہر چیز سے وحشت ٹپکتی نظر آتی تھی۔

سے زیب کو اس گھر کا بڑا بیٹا سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔
جیسے جیسے وقت گزر تا گیا۔ نائلہ کے دل میں زیب کے لیے نرمی اور محبت بڑھتی گئی تھی۔ اسی طرح فرحت تائی کے دل میں زیب کے لیے محبت کم ہوتی گئی۔ فرحت کے لیے بہن کی موت کو بھلانا بہت مشکل تھا۔ وہ ان سب کو اپنی بہن کی موت کا ذمہ دار سمجھتی تھیں۔
وہ سمجھتی تھیں کہ زیب بھی باپ کی طرح ہی بے ضمیر ہے۔ جس نے ماں پر ہونے والی زیادتیوں کو بھلا کر سوتیلی ماں سے اچھے تعلقات بنا لیے تھے۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھیں کہ زیب نے نائلہ کو ایک حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ لیکن تائی کو کون سمجھاتا۔ ان کی نفرت ضمیر' نائلہ اور اس کے بچوں تک محدود نہیں رہی تھی۔ بلکہ اس نفرت کی لپیٹ میں ان کا سگا بھانجا بھی آگیا تھا۔
انہوں نے اوپر والوں کا مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا۔ نہ وہ خود اوپر جاتی تھیں اور نہ ہی اپنی بیٹی ثانیہ کو اوپر جانے دیتیں۔ اسی طرح زیب کے چھوٹے بھائیوں کو بھی نیچے آکر کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ شاہ زیب کے اندر بھی پہلی مرتبہ اپنی خالہ کے لیے بدگمانی اور بے زاری بڑھنے لگی تھی۔ جس کو وقتاً" فوقتاً" نائلہ کی چرب زبانی سے تقویت ملتی تھی۔ نیچے والوں سے دور کرنے میں کچھ تو فرحت کا اپنا ذاتی ہاتھ تھا اور کچھ نائلہ کی پھیلائی بدگمانیوں کا کمال تھا۔ یوں زیب اپنے تایا کی فیملی سے دور ہوتا گیا۔
یہ ان دنوں کی بات تھی جب شاہ زیب پی آئی اے کی طرف سے اسپیشل کوٹے پر ایرونا ٹیکل انجینئرنگ کرنے کاکول اکیڈمی میں زیر تعلیم تھا۔ ان دنوں اس کے امتحانات اور اسپیشل پروجیکٹ چل رہے تھے۔
اس مشقت بھری زندگی میں باپ کی معمولی ملازمتوں کو دیکھتے ہوئے اس نے ہمیشہ ایک ہی خواب دیکھا تھا۔ زیادہ پڑھنے کا خواب' آگے بڑھنے کا خواب۔ ایک اونچا مقام پالینے کا خواب۔
وہ اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ایک تعلیم ہی تھی۔ جو اسے اچھی زندگی مہیا کر سکتی تھی اور وہ اپنے بھائیوں کو ایک خوش حال زندگی دینے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ لیکن پاسنگ آوٹ سے پہلے پہلے شاہ زیب کو ایک زبردست دھچکا لگا تھا۔ نائلہ نے رات کو ہی اسے فون کر کے بتایا تھا۔
"تمہاری خالہ نے ثانی سے تمہارا رشتہ توڑ دیا ہے۔ بقول تمہاری خالہ کے جیسا باپ' ویسا بیٹا۔ کل باپ میری بہن پہ سوکن لے آیا تھا۔ بیٹے سے کیا بعید وہ بھی زندگی کے کسی موڑ پر میری بیٹی پر سوکن لے آئے۔ میں ایسی رشتہ داری سے توبہ کرتی ہوں۔"
خالہ پلس تائی کے یہ الفاظ زیب کے لیے کسی جذباتی دھچکے سے کم نہیں تھے۔ تائی نے کس طرح اس کی امی سے کیا وعدہ توڑ دیا تھا؟ وہ کس طرح اس کی امی سے طے کیا رشتہ توڑ سکتی تھیں۔
زیب کے لیے یہ بہت تکلیف دہ حقیقت تھی۔ اسے قبول کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جب وہ اپنا دل ٹٹول رہا تھا اور اسے اپنے دل کے خالی پن پہ جھٹکے لگ رہے تھے۔ آن کی آن میں اس کا دل امنگوں اور خوابوں سے خالی ہو گیا تھا اور اس خالی مکان میں سناٹے گونجنے لگے تھے اور ان سناٹوں کے اندر کہیں دور میٹھا میٹھا درد اٹھ رہا تھا۔ یہ درد لادوا تھا اور شاید محبت کے سارے ہی درد لادوا ہی ہوتے ہیں۔
جس طرح زیب نے اپنی سوتیلی ماں کو قبول کر لیا تھا' جس طرح اپنی ماں کی موت کو قبول کر لیا تھا' اسی طرح تائی کے فیصلے کو بھی چپ چاپ قبول کر لیا' لیکن وہ ایک مرتبہ اپنی تائی کے سامنے جا کر ان سے دو ٹوک بات کرنے کا ارادہ ضرور رکھتا تھا۔ اس نے دوران پروجیکٹس چھٹی کے لیے اپلائی کر دیا۔
اور یہ شاہ زیب کی سب سے بڑی بدقسمتی تھی جب وہ تائی سے ملنے آرہا تھا۔ وہ زیب کے آنے سے پہلے ہی ابدی سفر پہ چل پڑیں۔ جس شب وہ اپنے شہر آنے کے لیے ٹکٹ کٹوا رہا تھا۔ اسی شب اس کی پیاری خالہ اور تائی اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے وفات پا گئی تھیں۔ ساری رنجشیں اور کدورتیں دھری

کی دھری رہ گئیں۔ اس نے ٹکٹ پھاڑا اور واپس چل دیا۔ جنازہ تو ہو چکا تھا۔ اب جانے کا کیا فائدہ تھا۔

پھر جب وہ چھٹی پہ گھر آیا تو ادھر کے حالات یکسر بدل چکے تھے۔ وہ ثانی جو دریچوں اور درزوں میں سے چھپ چھپ کر شاہ زیب کو دیکھا کرتی تھی۔ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں رہی تھی۔ شاہ زیب اس وقت شدید خجالت اور شرمندگی میں مبتلا ہوا' جب اس نے تایا سے افسوس کرنے کے بعد ثانی سے ملنا چاہا اور تائی کی وفات پہ تعزیت کرنا چاہی تھی' لیکن ثانی نے اس سے ملنے سے معذرت کرلی تھی۔ تایا کا رویہ بھی حوصلہ شکن تھا۔ شاہ زیب دنوں اس تکلیف دہ رویے پہ پریشان رہا۔ ان ہی دنوں ۔ نائلہ موقع سے فائدہ اٹھاکر شاہ زیب سے زیادہ قریب ہو گئی تھیں۔ ثانی کے رویے سے دل برداشتہ شاہ زیب نے افزا سے فطری سا دوستانہ تعلق رواں رکھا تھا' لیکن اس تعلق میں بھی حد فاصل برقرار تھی۔

پھر یوں ہی بدگمانیوں میں چھپے دن گزرتے چلے گئے تھے۔ وہ بطور ایرو ناٹیکل انجینئر پی آئی اے میں شان دار عہدے پہ کام کرنے لگا تھا۔ اس کی جاب کے ساتھ ہی گھر کے حالات بدلتے گئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ابو کو مستقل معذوری نے آن دبوچا تھا۔ ابو کی ملازمت چھوٹ گئی تھی۔ اب وہ گھر تک محدود تھے۔ گزرتے وقت نے ان کے سارے دم خم نکال دیے تھے۔ اب وہ بہت رنجیدہ رہتے تھے۔ اکثر ماضی کی یادوں کو دہراتے تھے۔

نائلہ کی ساری توجہ زیب اور افزا پہ تھی۔ وہ چاہتی تھیں۔ زیب کی افزا سے شادی ہو جائے۔ ان کی بیٹی کا مستقبل محفوظ ہو اور وہ ایک شان دار زندگی گزارے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ زیب کو ثانی سے متنفر کیا جاتا۔ وہ اپنی چالوں میں لگی ہوئی تھیں۔ زیب کو ملازمت ملنا ایک ایسی خوشی تھی جس پہ پھوپھی بھی نائلہ سے تمام رنجشیں بھلا کر مبارک باد دینے چلی آئی تھیں۔

نائلہ نے بھی شاہ زیب کی کامیابی کو بھرپور طریقے سے منایا تھا۔ ایک پرتکلف دعوت پہ پورے خاندان کو اکٹھا کیا گیا تھا۔ دور نزدیک کے سارے ہی رشتے دار آئے تھے۔ لیکن تایا اور ثانی نے آنے سے معذرت کرلی تھی۔ شاہ زیب نے سنا تو اسے نہ غصہ آیا' نہ افسوس ہوا۔ اب اتنے سالوں میں ڈھیروں رنجشوں کے بعد دل پہ بے حسی کا خول تو چڑھ ہی گیا تھا۔ اس نے ماں کے غصے اور جھنجلاہٹ پہ بس اتنا ہی کہا۔

"ان کو بلانا آپ کا فرض تھا۔ نہیں آتے تو نہ آئیں۔ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔" شاہ زیب پرسکون تھا اور نائلہ کے سکون کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس دعوت کے بعد نائلہ کا کڈنی آپریشن دوسرا ایسا موقع تھا جس پہ نیچے والوں کی لاتعلقی نے دونوں خاندانوں میں مزید تناؤ کی لکیر کو کھینچ دیا تھا۔ نائلہ نے اس بات کو دوسرے ہی رنگ میں پیش کیا تھا۔

"بہت ہی غرور چڑھ گیا ہے بھائی صاحب کی بیٹی کو۔ ظاہر ہے۔ جب ہارون نظر آرہا ہو تو۔۔۔" نائلہ کی ہر تان ہارون پہ ٹوٹتی تھی۔ لیکن ضمیر ہر صورت شاہ زیب کے طے شدہ رشتے کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ شاید مدحت کو دیے گئے زخموں کی تلافی اسی صورت کرنا چاہتے تھے' لیکن شاہ زیب ان کے ہاتھ نہیں آرہا تھا اور وہ جانتے تھے کہ شاہ زیب کو نائلہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔

☆ ☆ ☆

ایک تناؤ بھری فضا کو نائلہ کی تلخ آواز نے بہت شدت کے ساتھ تتر بتر کیا تھا۔ افزا نے ہونٹ بھینچ کر آلو کاٹنے شروع کر دیے تھے۔

جانے شاہ زیب کہاں چلا گیا تھا؟ ابو سے جھگڑے کے بعد وہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ اس کی تفکر بھری نظریں بار بار گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ نائلہ مسلسل بول رہی تھیں۔

"میری اتنے سالوں کی ریاضت کا یہ صلہ دیا؟ مجھے مکار اور چال باز کہا.... یہ انسانیت ہے تمہاری؟" وہ جیسے شدت غم سے پھٹ رہی تھیں۔

"غصے میں انسان کچھ بھی کہہ دیتا ہے۔ اپنے لاڈلے پہ تم حرف نہیں آنے دیتیں۔ مجھے غصہ اسی نے دلایا تھا۔ نہ وہ ایسی بات کرتا۔ نہ میں تمہیں کچھ کہتا.... بہرحال وہ تمہاری شہ پہ ہی سب کچھ کرتا ہے۔" ضمیر کا لہجہ دوٹوک تھا۔ اٹل اور سنجیدہ.... امی کا پارہ کچھ اور اوپر کو چڑھ گیا تھا۔

"میری شہ پہ؟" وہ چیخ پڑی تھیں۔ "کیا وہ خود عقل اور سمجھ بوجھ نہیں رکھتا؟ اس کی آنکھیں ہیں اور وہ سب دیکھتا ہے۔" ان کا انداز زہر بھرا تھا۔

"کیا دیکھتا ہے وہ؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔" ان کا ٹھنڈا ہوتا غصہ پھر سے ابل پڑا تھا۔

"نیچے جو کچھ ہوتا ہے۔" نائلہ جز بز ہوئی تھیں۔

"یہی پوچھ رہا ہوں۔ کیا ہوتا ہے نیچے؟ جو مجھ سے مخفی ہے۔" ان کے انداز میں شدید کوفت اور غصہ تھا۔

"ہارون کے پھیرے۔ اپنے ماموں کا دایاں بازو تو وہی ہے۔ ایسے تو نہیں ماموں کی اتنی خدمتیں کرتا۔" نائلہ نے دبی آواز میں کہہ ہی دیا تھا۔ اور معمول کے مطابق ابو بھڑک اٹھے تھے۔ افزا کا سہا دل کچھ اور سہم گیا تھا۔

"تم بات کو جان بوجھ کے غلط رنگ دیتی ہو۔ ہارون اگر اپنے ماموں کا خیال رکھتا ہے تو کم از کم میرے ان نالائق بیٹوں سے بہتر ہے۔ جنہیں اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ نیچے تایا کا حال ہی پوچھ آئیں۔" انہوں نے عینک جھٹک کر جتلایا تھا۔

"تو وہ مطلب سے ہی آتا ہے۔ میرے بیٹے مطلبی نہیں ہیں۔" نائلہ چمک کر گویا ہوئی تھیں۔

"کیا مطلب؟" وہ پھر سے چونکے تھے۔ انہیں نائلہ سے کسی بھی اچھی بات کی امید نہیں تھی۔

"آپ تو جیسے بچے بن گئے ہیں۔ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ آپ کی بہن اور بھانجے کی نظر ہے نشاۃ الثانیہ پہ۔" نائلہ تلخی سے چبا چبا کر بولی تھیں اور ابو نے انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

"جب ہماری طرف سے خاموشی ہو گی۔ تو اور لوگ آگے ضرور بڑھیں گے۔ آخر ہیرا جیسی بچی ہے ہماری۔" ان کے لہجے میں شیرینی گھل گئی تھی۔ "جس گھر جائے گی چراغاں کرے گی۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"مجھے اس لالٹین سے اپنا "اندھیر خانہ" روشن نہیں کرنا۔ سنا تم نے۔" نائلہ نے چبا چبا کر کہا تھا۔ وہ خاموش ہو گئے تھے اس عورت سے مغز ماری کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب انہیں کوئی عملی قدم اٹھانا تھا۔ شاہ زیب مانتا یا نہ مانتا۔ وہ اس کے باپ تھے اور بیٹے پہ اختیار رکھتے تھے۔ ایک دن اسے تسلیم کرنا ہی تھا۔

اسی لیے انہوں نے بہن کو رازدار بنانے کے لیے رات کو فون کھڑکا دیا۔ آپا بھی بھری بیٹھی تھیں۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ.... بے بھاؤ کی سنا ڈالی تھیں۔

"بہت بڑا افسر بن گیا ہے تمہارا بیٹا۔ قدم زمین پر نہیں ٹکتے۔ رشتوں کا اسے کوئی احساس باقی نہیں رہا۔ نہ بوڑھے تایا کے جھکے کندھے دکھائی دیتے ہیں۔ میں کہتی ہوں۔ ابھی کے ابھی اپنے بیٹے سے فیصلہ کرواؤ۔ ورنہ میں اگلے چند دنوں میں بارات لے کر پہنچ جاؤں گی۔ تمہاری بیوی کے تو ارادے ہی نہیں لگتے۔" آپا کی لمبی تقریر نے ضمیر کے پسینے چھڑا دیے تھے۔ آپا ایسی ہی تھیں۔ اپنی سنانے والی۔ کسی اور کی کہاں سنتی

تھیں۔ ضمیر بے چارے ارے ارے کرتے رہ گئے تھے۔ آپا خاموش ہوئیں تو انہیں بولنے کا موقع ملا۔
"آپا! کسی اور غریب کی بھی سن لیا کریں۔ اسی لیے تو فون کیا ہے۔ اور آپ ہارون کی بات بیچ میں نہ لائیں۔ ثانی میری بیٹی ہے اور میری ہی رہے گی۔" ان کا انداز فیصلہ کن تھا۔
"ارے کوئی عملی قدم بھی تو اٹھاؤ۔ یا باتوں سے ہی ٹرخاتے رہو گے۔" آپا نے کھنچائی کرتے ہوئے جتلایا تھا۔
"یہی تو آپ سے طے کرنا ہے۔" ضمیر کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔ آپا بھی ہمہ تن گوش ہوئیں۔ پھر دونوں ایک فیصلہ کر کے اس پہ متفق ہو گئے تھے۔ اگلا دن ڈھیر ساری حیرانیوں کے ساتھ طلوع ہونے والا تھا۔

☆ ☆ ☆
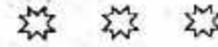
وہ نماز عشاء ادا کر کے گھر کی طرف لوٹا تھا۔ دل کچھ سکون سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ لیکن یہ کیفیات بھی لمحاتی تھیں۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ گیٹ کے دوسری طرف اس کا چین سکون لوٹنے والی کھڑی تھی۔
اس نے جوں ہی بیل پہ ہاتھ رکھا۔ گیٹ اگلے ہی پل کھل گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کے انتظار میں ہی کئی گھنٹوں سے کھڑی تھی۔ جیسے ہی شاہ زیب کی اس پہ نگاہ پڑی تھی۔ اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔
وہ اک تلخ نگاہ ڈال کر آگے بڑھنے لگا تھا جب ثانی نے اچانک اسے آواز دے کر روک لیا تھا۔
وہ رکا ضرور مگر مڑا نہیں تھا۔ اس کی پشت ثانی کی طرف تھی۔ ثانی نے بمشکل ہی اپنے اعتماد کو برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی۔
"مجھے آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔" وہ بمشکل ہی بول سکی۔
"لیکن مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔" اس نے تلخی سے کہا۔ ثانی لمحہ بھر کے لیے منجمد ہو گئی تھی۔ اسے شاہ زیب سے اس درجے رکھائی کی امید نہیں تھی۔
"زیب......" وہ جیسے خفت سے سرخ پڑ گئی تھی۔
"ایسا کیا ہو گیا ہے۔ جو تم مجھ سے بات کرنے کے بھی روادار نہیں؟" ثانی نے ساری انا کو پس پشت ڈال کر بالآخر سوال کر ہی دیا تھا۔
"یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔" وہ تلخی سے گویا ہوا تھا۔
"یہی جاننے کے لیے تو یہاں کھڑی ہوں۔" ثانی کا انداز بھی تلخی لیے ہوئے تھا۔ شاہ زیب نے ایک سلگتی نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی۔
"تم مجھ پہ ایسا کوئی حق نہیں رکھتیں۔" شاہ زیب نے جیسے اسے ہلا ڈالا۔ ثانی اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔
اور وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ کس رشتے کے تحت وہ اس سے سوال نامہ کھولے کھڑی تھی۔ وہ رشتہ جو تلخیوں کی گرد تلے دب گیا تھا۔
"میں تم لوگوں کے اس سرد رویے کی وجہ پوچھنا چاہتی تھی۔" اس کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ شاہ زیب اس کا گلابی ہوتا چہرہ دیکھنے لگا۔
"اور اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ جو کچھ تم کرتی پھر رہی ہو۔" اس نے دھیمی سلگتی آواز میں جتایا تھا۔ شاید وہ گلاس وال ٹوٹنے پہ اس کے رد عمل کی نشاندہی کر رہا تھا۔
"جو ریمز لوگوں نے نقصان کیا؟ اسی کے لیے، ہے نا؟ ٹھیک ہے ہمیں زیادہ غصہ کر گئی تھی۔ اسی لیے تو معذرت۔" ثانی نے دھیمی آواز میں کہنا چاہا تھا تب ہی شاہ زیب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔
"تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت آخر کیوں پیش آ گئی؟ حیرت کی بات ہے۔" اس کا انداز گہرا کاٹ دار طنزیہ تھا۔ ثانی نے بمشکل ہی اپنے حلق سے نیچے اتارا۔ وہ صرف ڈیڈی کے لیے اتنا کچھ برداشت کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ شاہ زیب کی لاتعلقی سے بہت رنجیدہ ہوتے تھے اور اب تو وہ ثانی کے لیے سنجیدگی کے ساتھ کوئی فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔
کیا تھا اگر وہ اپنی انا کو ایک طرف رکھ کے چھوٹی سی

کوشش کرلیتی۔ اور اس نے یہ کوشش کر ہی لی تھی۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا تھا؟ بس اپنا آپ ہی ارزاں کیا تھا۔ اور اس کے لیے اب وہ اندر ہی اندر کٹ رہی تھی۔

"زیب! تم اتنے بدگمان کیوں ہو..." نہ چاہتے ہوئے بھی ثانی کے ہونٹ سوالیہ حالت میں پھڑپھڑائے تھے۔ یہ ایسا سوال تھا جس نے زیب کو لمحہ بھر کے لیے چونکا دیا تھا۔ وہ اس کے سادہ نقوش سے سجے بے انتہا سفید چہرے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کے نقش عام سے تھے۔ پھیلی سی ناک ' قدرے بھرے بھرے ہونٹ ' آنکھیں سیاہ تھیں اور رنگت دودھ سی سفید ' بالکل تائی کی طرح... وہ عام سی تھی ' افزا کے سامنے تو کچھ بھی نہیں تھی۔ بس اس کی چمپئی سی رنگت اسے سب میں ممتاز کردیتی تھی۔

زیب نے گہرا سانس بھرا اور اپنی نگاہوں کا رخ موڑ لیا تھا۔ وہ اس کے سحر سے آزاد ہی رہنا چاہتا تھا۔

"اگر تم یہ سوال خود سے کرو تو تمہیں جواب مل جائے گا۔"

زیب نے تلخی سے جواب دیا اور اوپر سے جھانکتی امی کی پکار پہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ اس حال میں کہ ثانی ساکت کھڑی تھی۔ اتنی ساکت کہ ہارون کے آنے اور اونچا اونچا چلانے کا بھی اسے پتا نہیں چلا تھا۔

ہارون خوشی کے عالم میں اس کے گرد گھومتا بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ اس کے عجیب انداز پہ ثانی حیران و پریشان تھی۔ جبکہ وہ چلا چلا کر بتا رہا تھا۔

"تمہارے لیے گڈ نیوز لایا ہوں ثانی! میری دبنگ والدہ تشریف لا رہی ہیں۔ ایک خاص مقصد کے لیے۔" اس کی اونچی چہکار اوپر تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اوپر یعنی چاچو کے پورشن تک... ثانی نے دہل کر اچانک اوپر کی طرف دیکھا۔ وہاں کچن کی کھڑکی میں عجیب نگاہوں سے دیکھتی نائلہ کھڑی تھیں جبکہ اندرونی دروازے کا لاک گھماتا زیب بھی ابھی تک سیڑھی کے آخری سرے پہ کھڑا تھا۔ نیچے کی طرف دیکھتا ہوا۔ ہارون کو اور اسے۔ عجیب بھسم کردینے والی نگاہوں سے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا زہر تھا۔ عجیب سی تپش تھی ' وہ ہارون کو زہر خند نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جس سے ہارون قطعاً" بے نیاز تھا۔ اور ثانی!

ثانی پہ کھڑے کھڑے ہی انکشاف ہو گیا تھا۔ وہ سوال جو اسے زیب سے پوچھا تھا۔ اس کا جواب زیب کی زہر اگلتی نگاہیں دے رہی تھیں۔

"میری نفرت کی وجہ تمہارے پہلو میں کھڑی ہے۔" وہ اس کی نگاہوں کا زہر بھرا جواب خود تک پہنچتا دیکھ کربت کی مانند ساکت ہو چکی تھی۔

✼ ✼ ✼

اس نے اوون سے گرما گرم پزا نکالا ' ٹیبل سے کوک کے ٹن اٹھائے اور کب سے ساکت اور چپ چاپ بیٹھی ثانی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس وقت وہ ڈیڈی کی اسٹڈی میں بیٹھے تھے۔ ٹرے اس نے سینٹرل ٹیبل پہ رکھ دی تھی۔ پگھلی ہوئی پنیر اور گرما گرم پزا تو ثانی کی کمزوری تھا۔ ہارون کو اب تشویش ہونے لگی۔

"ثانی! میں تمہارے لیے پزا لایا ہوں اور تم نے پزا کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ پزا کو دیکھ کر تو تمہاری بے ہوشی بھی ٹوٹ جائے۔" وہ بات کو مزاحیہ رنگ دیتا اندر سے بہت متفکر تھا۔ ثانی کے انداز بہت پریشان کن تھے۔ وہ اتنی خاموش تھی کہ حد نہیں۔ ہارون کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"میں تو گڈ نیوز سنانے آیا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا۔ تم یہاں صف ماتم بچھا کر بیٹھی ہو۔" ہارون نے چڑ کر جتلایا تھا۔ وہ گڈ نیوز پہ تھوڑا سا چونکی تھی۔ پھر اسے دیکھنے لگی۔ جیسے پوچھ رہی ہو "کیا؟"

"مام آرہی ہیں... بلکہ بلایا گیا ہے انہیں۔" اس نے لہجے میں ڈرامائی تاثر بھرتے ہوئے کہا تھا۔ ثانی پوری طرح سے چونک گئی تھی۔

"کس نے بلایا ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

ہارون کچھ دیر مسکراتا رہا۔ پھر آنکھیں پھیلاتا

بڑے انداز میں بولا تھا۔

"ضمیر ماموں نے بلایا ہے.... خاص مقصد کے لیے۔" بالآخر اس نے بتا ہی دیا تھا۔

"کون سا مقصد؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بہت احمق ہو ثانی! اتنا بھی نہیں سمجھتیں۔ ضمیر ماموں، مام کے ساتھ یہاں آئیں گے۔ تمہاری بات پکی کرنے کے لیے۔" ہارون نے جیسے دھماکا کیا تھا۔ ثانی ہکابکا رہ گئی۔

"یہ تم سے کس نے کہا؟ مطلب یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ زیب تو۔" ابھی تو زیب کی اتنی جلی کٹی سن کر آ رہی تھی۔ پھر اس کے عجیب و غریب انداز، غصہ، نفرت؟ اور اب یہ انکشاف؟ ثانی کا تو دماغ ہی گھوم گیا تھا۔

"زیب کی ایسی کی تیسی.... ماموں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ شکر ہے ورنہ زیب کی جگہ مجھے قربان ہونا پڑتا۔" اب وہ بڑے خوشگوار موڈ میں اسے چھیڑ رہا تھا۔ ثانی کچھ سمجھی نہیں۔

"بھلا کیسے؟" اس نے غائب دماغی سے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ میری والدہ تو تلی بیٹھی تھیں تمہیں اپنی بہو بنانے کے لیے۔" ہارون کھلکھلایا تھا۔ "اور تم تو جانتی ہو۔ میں نے اپنا دل اوپر اٹکا رکھا ہے۔"

"اوپر کہاں.... آسمان پر۔" ثانی پہلی مرتبہ قدرے ہلکے پھلکے لہجے میں بولی تھی۔ ایک دم جیسے وہ اعصاب شکن کیفیت سے نکل آئی تھی۔ یعنی اوپر اس کے چاچو اس معاملے پہ اب کوئی حتمی فیصلہ کرنے پہ تیار تھے؟ تب نائلہ یا زیب بھلا کیا کر لیتے؟

"اب زبان کہاں سے آ گئی؟" ہارون تو کلس ہی گیا تھا۔ ثانی دھیمے سے مسکرا دی۔ اس نے ٹرے اپنی طرف کھسکالی تھی۔ اور اب مزے سے پزا کھانے میں مگن تھی۔ ہارون اس کا یا پلٹ پہ حیران تھا۔ کہاں تو انیس سو بیس کی ہیروئن بنی اداس بلبل کی طرح بیٹھی تھی۔ اور کہاں اب مسکراہٹ ماند نہیں پڑ رہی تھی۔ صرف ایک ہلکا سا سندیسہ ملنے پہ۔ ہارون بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

"تم تو ابھی سے آنکھیں بدل رہی ہو ثانی!" ہارون نے کچھ دیر بعد آہ بھرتے ہوئے کہا تھا۔ ابھی تو مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں اوپر بھجوانا ہے۔ اور اپنا مطلب نکلوانا ہے۔" وہ اپنی اگلی پلاننگ اس کے گوش گزار کر رہا تھا۔ ثانی نے پزا کا بڑا سا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا۔

"یہ تم بار بار مجھے اوپر بھجوانے کی بات کیوں کرتے ہو؟ میرا ابھی مرنے کا ارادہ نہیں۔"

ہارون اس کی عقل پہ بس مام کناں دیکھتا رہ گیا تھا۔

"شادی کی بات کر رہا ہوں۔ کیا رخصت ہو کر اوپر نہیں جاؤ گی ڈفر!" وہ اسے گھورتے ہوئے جتا کر بولا تھا۔ ثانی بس "آہم آہم" کرتی رہ گئی تھی۔

پھر وہ اس سے اپنی "یک طرفہ" محبت اور شادی کی پلاننگ کرنے لگا تھا۔ اور ثانی پہلی مرتبہ بڑے دل کے ساتھ اس کی پلاننگ میں اپنے مشوروں کا اضافہ کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بات سنیں آپا! بیچ میں ہارون کہاں سے ٹپک پڑا؟ ثانی میرے زیب کی منگیتر ہے۔" ضمیر بہت خفگی کے عالم میں بڑی بہن سے مخاطب تھے۔ جو بڑے طمطراق سے تخت پہ بیٹھی تھیں۔ اور سامنے میز پہ کچھ ایسا سامان رکھا تھا جسے دیکھ کر نائلہ کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا تھا۔ اور افزا کا دل بالکل خالی۔

"ارے یہ تو تمہاری لاتعلقی کی وجہ سے سوچا تھا۔ تاکہ خضر کی پریشانی کم ہو سکے۔ اب کیوں سوچوں گی۔ میرے لیے شاہ زیب اور ہارون برابر ہیں۔" آپا نے فوراً وضاحت کی تھی۔

وہ بڑے دل سے تیار ہوئے تھے۔ سفید لٹھے کا کڑکڑاتا سوٹ، نئی نکور چپل، بال نفاست سے بنے ہوئے تھے۔ تازہ بہ تازہ خوشبو بھی لگا رکھی تھی۔ یہی حال آپا کا تھا۔ مونگیا رنگ کا بریزے کا سوٹ۔ کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں اور ہلکا پھلکا نفیس میک اپ۔ وہ بھائی کے ساتھ نیچے جا کر شادی کی تاریخ پکی کرنے کے

لیے پوری پوری تیار تھیں۔ میز پہ مٹھائی کی ٹوکری، پھل وغیرہ رکھے تھے۔ جو بطور خاص ضمیر نے چھوٹے بیٹوں سے کہہ کر منگوائے تھے۔ اور جسے دیکھ کر نائلہ کے سینے پہ سانپ لوٹ رہے تھے۔ اور اپنے ذہن میں جلد از جلد کوئی تگڑی پلاننگ سوچ رہی تھیں۔

"اب چلنا ہے کہ نہیں؟" آپا نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیوں نہیں چلنا۔ اب یہ بچے مجھے نیچے اتاریں تو تب نا۔" انہوں نے لاچاری سے بیٹوں کو آواز دی تھی۔ تب ہی نیچے سے ہارون آگیا تھا۔ جسے دیکھ کر افزا جانے کیوں غیر محسوس انداز میں منظر سے ہٹ گئی تھی۔ جبکہ اس کی مشتاق نگاہیں افزا کو نہ پا کر خاصی مایوس ہوئی تھیں۔

ادھر نائلہ کو شوہر سے اندر ہی اندر اتنی بڑی پلاننگ کی امید نہیں تھی۔ اور اب ان کے دل کو پتنگے لگ گئے تھے۔

انہیں جو کچھ بھی کرنا تھا۔ ان ہی چند ساعتوں میں کرنا تھا۔ کچھ سوچ کر انہوں نے کچن سلیب پہ رکھا موبائل دبوچا اور سیڑھیاں چڑھ کے اوپر ٹنکی کے پاس آ گئی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ زیب سے ہم کلام تھیں۔

"تمہارا باپ مٹھائی کے ٹوکروں سمیت نیچے جا رہا ہے۔ اس دوغلی منافق لڑکی کا رشتہ لینے۔ جس نے آنکھیں کہیں لڑا رکھی ہیں اور شادی کہیں کرے گی۔ تمہاری پھوپھی بھی آئی بیٹھی ہے۔ اتنی ہمدرد ہے تو اپنے بیٹے سے کر لے۔" زیب ان کی بات سن کر چکرا گیا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھ سے پوچھے بغیر۔"

"جب ہو جائے گا تو تمہیں پتا چلے گا۔" وہ جیسے رو دینے کو تھیں۔

"میں ابو کو فون کرتا ہوں۔" اس نے جیسے فیصلہ کیا تھا۔

"ہرگز نہیں۔ فون سے کام نہیں چلے گا۔ تم گھر آؤ۔" انہوں نے تحکم سے کہا تھا۔ زیب نے ہامی بھر لی۔

"اوکے، میں آتا ہوں۔ ڈونٹ وری امی! کچھ بھی نہیں ہوگا آپ کی مرضی کے خلاف۔" وہ انہیں تسلی دے رہا تھا۔ لیکن نائلہ کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

"تم دیر نہیں کرو زیب! ورنہ عمر بھر پچھتاؤ گے۔ وہ لڑکی تمہارے قابل نہیں۔" وہ نفرت کی انتہا پہ تھیں۔ اور اسے ہر ممکن حد تک متنفر کر رہی تھیں۔

جیسے ہی وہ فون بند کر کے مڑیں اپنے پیچھے افزا کو کھڑا پایا۔ وہ انہیں عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ نائلہ نے بے ساختہ نگاہیں چرالی تھیں۔ افزا دو قدم چل کر ان کے قریب آگئی تھی۔ وہ خوامخواہ ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ افزا ایک ٹک ماں کو دیکھ رہی تھی۔ انہیں اس کی نگاہوں سے الجھن ہونے لگی۔

"کیوں آئی ہو اوپر؟ نیچے رہتیں.... ان دونوں بہن بھائی کا پروگرام تو سنتیں۔" وہ بلاوجہ بولنے لگی تھیں۔ جیسے اپنی کچھ دیر پہلے والی گفتگو کا اثر مٹا رہی ہوں۔ افزا نے چبھتی نظروں سے انہیں دیکھ کر پوچھا تھا۔

"آپ زیب بھائی سے کیا بات کر رہی تھیں؟"

"تمہیں اس سے کیا؟" وہ خفگی سے کہہ کر نیچے جانے لگی تھیں۔

"امی! یہ ٹھیک نہیں ہے۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ نائلہ بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"کیا ٹھیک نہیں ہے؟" ان کی تیوری پہ بل آگئے تھے۔

"آپ نیچے جا کر ابو سے کوئی لڑائی نہیں کریں گی۔ مجھے لڑائی سے ڈر لگتا ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں ان کو کرنے دیں۔" اس نے بھرائی آواز میں التجا کی تھی۔ نائلہ جیسے پھٹ پڑیں۔

"کیوں کرنے دوں؟ ساری زندگی قربانیاں میں نے دیں۔ محبت دی، پالا پوسا۔ پڑھایا لکھایا۔ اب انعام کا وقت آیا ہے تو پلیٹ میں سجا کر کسی اور کو پیش کر دوں؟ اور وہ بھی اس کے جو آتے ساتھ ہمیں اس گھر سے چلتا

کر کے اپنا انتقام پورا کرے گی۔ اپنی خالہ پہ نادیدہ مظالم اور سوکن کا انتقام۔" وہ نفرت سے سر جھٹک کر نیچے چلی گئی تھیں، نیچے زیب آچکا تھا۔ وہ بہت اونچا بول رہا تھا۔ افزا کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ لاکھ وہ اس کی چاہت تھا۔ بے شک وہ آنکھوں میں اترنے والا خواب تھا۔ وہ نصیب سے مل جاتا تو افزا خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی۔ اپنے نصیبوں پہ نازاں ہوتی۔ لیکن اسے اس انداز میں چالبازیوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کر کے حاصل کرنا اسے کبھی بھی گوارا نہیں تھا۔ کبھی بھی نہیں۔

وہ لرزتے قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

وہ امی کے لیے جھگڑ رہا تھا۔ کیونکہ ثانی امی کی پسند نہیں تھی۔ وہ ان کا سوتیلا بیٹا تھا۔ لیکن سگے بیٹوں سے بڑھ کر مان رکھتا تھا۔ وہ اب بھی امی کا مان بڑھا رہا تھا۔ اور باقی سب لوگ حیران و پریشان تھے۔ افزا وہیں ریلنگ پکڑے ساکت کھڑی تھی۔ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ دل ہراس کا شکار تھا۔

"یہ جو تماشا چل رہا ہے' اسے ختم کریں۔" زیب نے دو ٹوک لہجے میں باپ اور پھپھی کو واضح طور پر روک دیا تھا۔ اس کی نگاہیں میز پہ جمی تھیں۔ جس کے اوپر مٹھائی اور پھلوں کی ٹوکریاں تھیں۔

"کیوں ختم کریں۔ برسوں سے رشتہ طے ہے۔ کب تک ٹالتے رہیں۔ ہم تاریخ لینے جا رہے ہیں۔ تم اپنا ذہن بنالو۔ اسی مہینے کے آخر میں نکاح ہو گا۔" پھوپھو نے اپنے ازلی ونگ لہجے میں حکمیہ کہا تھا۔

"معذرت کے ساتھ پھوپھو! آپ کی یہ خواہش پوری کرنے سے قاصر ہوں۔ اس قربانی کے لیے کسی اور کو تیار کرلیں۔ میری طرف سے معذرت ہے۔" وہ سخت مگر دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

"تم شادی نہیں کرو گے؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے زیب!" پھوپھو ہکلا گئیں۔ ابو خود گم صم بیٹھے تھے۔ یعنی اس نے پھوپھی کا لحاظ بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا۔ وہ کوئی حتمی فیصلہ کر چکا ہے۔ وہ لمحوں میں پوری جان سے ڈھے گئے تھے۔

"میں نے یہ کب کہا.... میں شادی کروں گا اور آپ کی خواہش کے مطابق اسی مہینے کے آخر تک کروں گا۔ لیکن امی کی پسند سے 'وہ جہاں کہیں۔" شاہ زیب نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ ابو نے اپنا سر تھام لیا اور پھوپھو کی حالت ایسی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

"نائلہ کی پسند؟" پھوپھو کا تو دماغ ہی گھوم گیا تھا۔ ان کی شعلہ بار نظریں نائلہ کی طرف اٹھیں۔

نائلہ نے نہایت اطمینان کے ساتھ سر ہلایا۔ ان کے اندر سکون کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

وہ حاضرین کو فتح مندی کے احساس کے ساتھ دیکھتی رہیں۔ اس وقت سب ہی موجود تھے۔ خاص طور پر ضمیر اور اس کی بہن۔ جو بڑی کار مختار سمجھی جاتی تھیں۔ سو یہ وقت بہت مناسب تھا۔ فیصلہ کرنے اور عمل کرنے کے لیے۔ نائلہ نے ایک نظر زیب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں مضبوطی تھی۔ استحکام تھا۔

"میں احسان مند ہوں اپنے بیٹے کی۔ جس نے مجھ ناچیز کی عزت رکھ لی۔ اور مجھے اس قابل جانا کہ میں اس کے لیے کوئی فیصلہ کر سکوں۔ میں آپ سب کے سامنے اپنی بیٹی افزا اور شاہ زیب کی نسبت کا اعلان کرتی ہوں اور شادی بھی اسی مہینے کے اختتام تک ہو گی۔" نائلہ نے بڑے سکون سے ان سب کے سروں پہ ایک دھماکا کیا تھا اور ہکا بکا زیب کا بازو تھام کر اندر کی طرف چلی گئی تھیں۔ جبکہ باقی سب لوگ پتھر کا بت بنے کھڑے تھے۔

یعنی نشاۃ الثانیہ سے نسبت توڑ کر نائلہ نے افزا کی منگنی شاہ زیب سے کر دی تھی اور اسی مہینے کے آخر میں تقریب نکاح ہونا قرار پا گئی تھی۔ یہ حقیقت قبول کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اور یہ خبر نیچے رہنے والوں کے سروں پہ بھی بم کی مانند گری تھی۔ ایک قیامت تھی جو آئی اور ٹھہر گئی۔ پھوپھو نیچے اتریں تو ان کے قدم شکستہ تھے۔ ڈیڈی کے

لیے یہ صدمہ کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا۔ وہ پہلے تو سن کر گم صم ہوئے' پھر ان کے سر پہ غصہ سوار ہو گیا تھا۔ وہ اتنا پیچھے کہ خدا کی پناہ۔ ایک ایک چیز ان کے ہاتھ تک پہنچتی اور تڑ تڑ ٹوٹتی چلی گئی۔ ڈیڈی کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ پھوپھو اور ہارون انہیں ہسپتال لے گئے۔

جانے کتنے گھنٹوں بعد ان کی واپسی ہوئی تھی۔

وہ انہیں سہارا دے کر اندر لے آئی۔ پھر جب وہ انہیں پلنگ پہ بٹھا کر واپس جانے لگی تھی تب ڈیڈی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا تھا۔

"ثانی! یہاں بیٹھو۔" انہوں نے زبردستی اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ ثانی سر جھکائے ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"ثانی! تمہیں دکھ ہوا ہے؟" ڈیڈی نے کپکپاتی آواز میں پوچھا تھا۔ ثانی کے اندر آنسو اترنے لگے تھے۔

"نہیں... دکھ کس بات کا؟ ان سے اور امید بھی کیا ہو سکتی تھی؟"

وہ بے آواز رو رہی تھی۔

"وقت مرہم ہوتا ہے۔ دھیرے دھیرے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اسے تسلی دے رہے تھے۔

"اور میں تو پہلے سے ہی جانتا تھا۔ اسی لیے آپا کو بلوا کر اوپر بھیجا تھا کہ آر یا پار کا فیصلہ تو ہو۔" ڈیڈی نے نم آواز میں بتایا۔ ان کا ہاتھ اس کا سر تھپک رہا تھا۔ ثانی نے لمبی سی سسکی کو اپنے لبوں کے اندر ہی روک لیا تھا۔ وہ ڈیڈ کو تکلیف سے بچانا چاہتی تھی۔

"ثانی! تمہیں بہادر بننا ہے۔ کیا تم اپنی کمزوری ظاہر کرو گی؟ ان لوگوں پہ جن کے دل پتھر اور لوہے کے ہیں۔ جنہیں رشتوں کا کوئی احساس نہیں کوئی پاس نہیں۔" وہ باپ تھے۔ اس کے اندر کا حال جانتے تھے۔

"ڈیڈی!" اس کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ "زیب نے ایسا کیوں کیا؟" وہ ان کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈیڈی کی آنکھیں بھی بھرنے لگیں۔

"احسان فراموش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جب وہ لوگ دھکے کھا رہے تھے' میں انہیں گھر لے آیا۔ اپنے گھر میں جگہ دی' تحفظ دیا۔ اور آج وہی لوگ میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ رہے ہیں۔" ان کا لہجہ بھیگا ہوا زخمی تھا۔ درد میں ڈوبا ہوا۔ ثانی سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

"وعدہ کرو' تم نہیں روؤ گی۔ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔" وہ خود رو رہے تھے اور اس سے نہ رونے کا عہد لے رہے تھے۔

وہ ڈیڈی کو کیسے بتاتی؟ درد کا تعلق چوٹ کی شدت سے ہوتا ہے۔ چوٹ جتنی سخت ہو' درد اتنا ہی گہرا ہوتا ہے۔ اور یہ درد تو تھا ہی لاوا... نہ درد کو افاقہ آتا۔ نہ درد کو کوئی علاج ملتا۔ اور مسیحا تو تھا ہی کوئی نہیں۔ وہ ڈیڈی کو کیسے بتاتی؟

✲ ✲ ✲

اور اوپر جیسے ہی شادی کا ہنگامہ اٹھا' نیچے ڈیڈی کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔

وہ اپنے بھائی سے شدید بدگمان تھے۔ ان کے نزدیک' ان کا بھائی اس حد تک "بے ضمیر" تھا کہ اسے اپنے بھائی کے دل پر خنجر چلا کر شادیانے بجانے کا کوئی قلق نہیں تھا۔ اب ڈیڈی کو کون سمجھاتا۔ ضمیر تو اس دن سے کمرہ بند کیے سب سے ناراض تھے اور بھائی کا سامنا کرنے سے گریزاں۔

اور کل سے تو ڈیڈی خاصے پراسرار بھی لگ رہے تھے۔ آج بھی صبح صبح تیار شیار ہو کر نکل گئے تھے۔ ثانی کو کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ وہ گھر کا کام ختم کر کے اب کھانا بنا رہی تھی۔ تب ہی باہر کا گیٹ کھلا تھا۔ چاچی لدی پھندی سی آگے آگے تھیں۔ پیچھے حسن' احسن تھے۔ شاپرز کا ڈھیر اٹھائے۔ شادی کی تیاریاں جو چل رہی تھیں۔ ثانی کا اندر تک زہر آلود ہو گیا تھا۔ اس نے غصے میں کچن کی کھڑکی ہی بند کر دی تھی۔ تب ہی کوئی چپکے سے کچن کے اندر داخل ہوا تھا۔ ثانی نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں چوکھٹے میں ہارون کھڑا تھا۔ ہمیشہ کے بالکل برعکس بجھا بجھا سا۔ ثانی نے گہرا سانس بھرا تھا۔

وہ آج اتنے دن بعد سوگ کی کیفیت سے باہر نکلا تھا۔

"صدمے سے نکل آئے ہو؟ آگیا ثانی کا خیال؟" اس نے ٹماٹر کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا تھا۔ ہارون چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا خالی پن تھا۔ ثانی کو اپنا طنز واپس لینا پڑا۔

"ہارون! کیا ہوا ہے؟ اب بس بھی کر دو۔" وہ ملامت سے بولی۔

"تم نے بس کردی؟ کیا یہی محبت تھی؟" ہارون کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ ثانی ہونٹ کاٹتی رہ گئی۔

"مجھے اپنا آپ ارزاں کرنا گوارا نہیں۔ اگر زیب مجھے دھتکار سکتا ہے اور مجھ پہ افزا کو فوقیت دے سکتا ہے تو میری انا کا تقاضا ہے کہ میں ان رستوں کی طرف بھی نہ دیکھوں۔ جہاں سے اس کا گزر ہو۔" ثانی شدید اذیت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ہارون اس کے جذباتی لہجے پہ قطعاً" جذباتی نہیں ہوا تھا۔ وہ بس پرسوچ نظروں سے صحن میں پھیلی دھوپ کو دیکھتا رہا۔

"اگر میری والدہ ماجدہ افزا کا رشتہ مانگ لیتیں تو یہ ساری صورت حال بگڑتی نہیں۔" ہارون نے کچھ دیر بعد ٹھیرا کتے ہوئے خیال ظاہر کیا تھا۔ ثانی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ چاچی ایسے ہی افزا کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیتیں؟ جبکہ ان کے سامنے زیادہ تگڑا پرپوزل موجود تھا۔ وہ شاہ زیب سے دست بردار نہیں ہو سکتیں۔" ثانی نے تھکی تھکی سانس بحال کرتے ہوئے بتایا تھا۔ ڈیڈی گھر کے اندر داخل ہوئے اور ان دونوں کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھرتے سوچنے لگے تھے۔ ہارون ماموں کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ پھر جلدی سے پانی اور گلاس لے کر باہر بھاگا۔ ڈیڈی برآمدے میں بیٹھ چکے تھے۔ ثانی نے پنکھا چلا دیا۔ ڈیڈی پانی پینے لگے تھے۔ گرمی کا زور کچھ کم ہوا تو چہرہ پونچھتے ہوئے بولے۔

"تم کب آئے ہو ہارون!"

"دنیا میں آئے ہوئے تو بہت سال ہو چکے ہیں ماموں! ویسے مردوں سے بھی ان کی عمر نہیں پوچھتے۔"

اس نے بات کو مزاحیہ رنگ دیا تو ڈیڈی بھی جانے کس وقت سے مسکرا دیے تھے۔ ثانی بھی ان کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

"اور جن کی عمر کا ایک ایک دن دل پہ لکھا ہو! پاگل تم اور زیب ایک دن میں پیدا ہوئے۔ ستائیس کا وہ ہو چکا ہے اور ستائیس کے تم.... ثانی تم دونوں سے ایک سال چھوٹی ہے۔" وہ حساب لگاتے ہوئے جانے کیسے بھول چوک میں اس دشمن جان کا ذکر لے بیٹھے تھے۔ حالانکہ زیب کا نام لینا بھی ڈیڈی نے حرام قرار دے دیا تھا۔ لیکن یہ رشتے اور محبتیں؟ ثانی بس ان کا منہ ہی دیکھتی رہ گئی تھی۔

"خیر چھوڑو۔ مجھے تم دونوں کو بتانا تھا۔ میں آج وکیل سے ملا ہوں۔ اس گھر کو ثانی کے نام کروانے کے لیے کچھ مشورہ کرنا تھا۔ اور اس سے بھی پہلے اوپر والوں کو تحریری اور قانونی نوٹس بھجوانا ہے۔ تاکہ میرا مکان خالی کر دیں اور کہیں اور جا کر شادی کے شادیانے بجائیں۔" ان کا لہجہ سرد اور دو ٹوک تھا۔ جبکہ ثانی اور ہارون تو اچھل پڑے تھے۔ ایک دم اتنا انتہائی فیصلہ؟ ضمیر چاچو کو گھر سے نکالنا؟ ایک مرتبہ پھر گھر سے بے گھر کرنا؟ یہ بہت جذباتی اور غلط فیصلہ تھا۔ ثانی کا دماغ گھوم گیا تھا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

"ہرگز نہیں.... آپ ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے؟ یہ تو صاف انتقامی کارروائی ہے۔ ضمیر چاچو کے بیٹے نے مجھے ٹھکرایا اور بدلے میں ہم انہیں گھر سے نکالیں گے۔ کبھی نہیں۔"

ثانی اتنی شدت کے ساتھ بولی تھی کہ ڈیڈی اس کے رد عمل پہ بالکل چپ کر گئے تھے۔ بے شک ڈیڈی کا غصہ بجا تھا۔ اس رشتے کے ٹوٹنے سے انہیں بہت ٹھیس پہنچی تھی۔ اپنی توہین بھی محسوس کی تھی اور ذلت بھی۔ لیکن ثانی کسی بھی صورت میں ایسے اوچھے ہتھکنڈے کے بارے میں سوچ نہیں سکتی تھی۔

✲ ✲ ✲

یہ شادی بلکہ افزا سے شادی بالکل غیر متوقع تھی۔

سچ تو یہ تھا۔ افزا تو کیا کسی سے بھی فوری طور پہ ایک نیا رشتہ بنانا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ وہ ماں کے دعوے کو سن کر لمحہ بھر کے لیے ڈگمگا گیا تھا۔ جب امی اس کی نسبت کا اعلان کر رہی تھیں۔ زیب تب انکار کر دیتا تو جانے کیا ہو جاتا؟ کچھ بہت ہی غلط کچھ ایسا جو امی کا اعتبار ہمیشہ کے لیے توڑ دیتا۔ اس لیے زیب تب خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن تنہائی میں اس نے امی سے ضرور بحث کی تھی۔ اس نے افزا کے لیے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ ہمیشہ بہن ہی سمجھا۔ اور امی اس کی جذباتی کیفیت کو نہیں سمجھ رہی تھیں۔ بلکہ انہوں نے زیب کا کندھا تھپتھپا کر بڑی محبت سے کہا تھا۔

"یہ تو تمہاری شرافت ہے بیٹا! تمہاری ان ہی پیاری عادتوں نے مجھے گرویدہ کر رکھا ہے۔ تب ہی تو میں نے ہمیشہ اپنی بیٹی کے لیے تمہیں سوچا۔ میری بیٹی کو تم سے اچھا ہمسفر نہیں ملے گا۔ اور تم حقیقتاً "اپنی ماں پہ ہو۔ ویسے ہی نرم مزاج، قانع اور صابر شاکر..... اپنے باپ کا تم پہ عکس بھی نہیں پڑا۔" نائلہ نے اعتراف کیا تھا۔ سچ تو یہ تھا۔ وہ مجبور ہو گیا تھا۔ امی کی محبت اور مان کے بار تلے دب گیا تھا۔ اور پھر اس نے خود کو وقت کے دھارے پہ چھوڑ دیا۔ وہ اسٹینڈ لیتا بھی کس لیے؟ کیا ثانی کے لیے۔

اس کے ذہن و دل پہ ہارون سوار تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان دونوں کا رشتہ بچپن سے طے ہے۔ زیب کی غیرت کو قطعاً "یہ گوارا نہیں تھا وہ ایسی لڑکی کو اپنی زوجیت میں لیتا۔ اس سے بہتر یہ تھا۔ وہ سارا الزام خود پہ لے کر راستہ بدل لیتا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس کے بدلے میں ابو کی ناراضی سہنا پڑی تھی۔ پھوپھی کی لعن طعن اور خاندان والوں کا بائیکاٹ۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ اس کی زندگی برباد ہونے سے تو بچ گئی تھی۔ لیکن اب بھی... آباد ہونے سے کوسوں دور لگتی تھی۔

افزا سے شادی، یہ ایک مشکل ترین سودا تھا۔ جو طے پا گیا تھا۔ بہت حد تک زیب نے خود کو سمجھا لیا تھا۔ بہت حد تک اس نے اپنا مائنڈ میک اپ کر لیا تھا۔ شادی تو کرنی ہی تھی۔ پھر افزا سے ہی سہی، چلو کوئی تو خوش ہوتا۔ اور اب شادی سے محض دو دن پہلے جب سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ بری، جہیز سب تیار تھا۔ زیب نے شادی کے نام پہ نائلہ کو دل کھول کے پیسہ دیا تھا۔ جس سے انہوں نے اپنے سارے چاؤ پورے کیے تھے۔

اور اب ابو کہہ رہے تھے کہ وہ زیب کے نکاح میں شامل نہیں ہوں گے۔ بھلا اس سے بڑی بے عزتی اور جگ ہنسائی کیا ہو سکتی تھی؟ نائلہ کا غصہ سوا نیزے پہ تھا۔ اور زیب بھی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیے بیٹھا تھا۔

"یہ تم لوگوں کا ذاتی فیصلہ ہے۔ اور میں اس فیصلے میں نہ شامل ہوں۔ نہ خوش ہوں۔ سو میں شادی میں شرکت بھی نہیں کروں گا۔" انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

ایک دم سکوت طاری ہو گیا تھا۔ ریکارڈر پہ گانے سیٹ کرتا سمیر باپ کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ ڈھولک پہ بے ڈھنگے پن سے ہاتھ مارتا رمیز بھی بت بن گیا۔ نائلہ کفگیر سمیت کچن سے باہر آ گئی تھیں اور ریلنگ پکڑے کھڑی زرد لباس میں مایوں کی دلہن کا روپ دھارے افزا سرسوں کا پھول بن گئی تھی۔

"آپ خوش ہوں یا نہ ہوں۔ آپ کی مرضی اس فیصلے میں شامل ہو یا نہ ہو۔ آپ نے ہر صورت تقریب نکاح میں شمولیت کرنی ہے۔ ورنہ آپ سمجھ لیجیے گا ابو! کہ شاہ زیب آپ کے لیے مر گیا ہے۔" وہ اتنے غصے کے عالم میں ایک دم بولا تھا کہ افزا نے بے ساختہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا تھا جبکہ سمیر، رمیز کی روح فنا ہو گئی تھی۔ کسی نے بھی زیب کو آج تک اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

"نیچے والوں کی آپ کو بہت پرواہ ہے۔ ان کے لیے آپ اپنے بیٹے سے عداوت رکھیں گے۔ تو سن لیں ابو! اور نیچے جا کر بتا دیں۔ میں تو اپنے ہر عمل اور ہر رشتے میں فیئر ہوں۔ میری نیت صاف ہے اور میں راہیں

بدلنے والا بھی نہیں۔ لیکن مجھے ایسی عورت کسی بھی قیمت پر قبول نہیں۔ جس کے دل میں کوئی اور ہو۔"

وہ اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ جبکہ ضمیر اپنا سر تھام کر بیٹھے تھے۔ جیسے اس کی بات سمجھنا چاہتے ہوں۔ اور جب انہیں بات سمجھ میں آگئی تو ان کے جسم کا سارا خون چہرے پہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ انہوں نے میز پہ رکھی ایک ایک چیز اٹھا کر توڑ دی تھی۔ ان کا غصہ کسی قیمت پہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ اور مغلظات کا ایک طوفان ان کے لبوں سے نکل رہا تھا۔ وہ جیسے منہ سے کف اڑا رہے تھے۔

"بدذات عورت! ثانی کے بارے میں یہ سارا زہر کس نے زیب کے اندر بھرا ہے؟ کس نے ثانی پہ کیچڑ اچھالا؟ اس کے کردار پہ انگلی اٹھائی لعنت ہو تم سب پر ... یہ دن دیکھنے کے لیے زندہ تھا میں؟ تم میری بھتیجی کو بدنام کرتی ہو صرف اپنا مطلب نکالنے کے لیے۔" وہ چیخ چیخ کر تھک گئے تھے۔ ان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ سمیر اور رمیز نے بمشکل انہیں قابو کیا تھا۔ انہیں پانی پلا کر اندر لے گئے تھے۔ نائلہ سر سے بلا ٹلتے ہی گہرا سانس بھرتی فرش سے کانچ اٹھانے لگی تھیں۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس خبطی بڈھے کا۔ حد ہے پکڑ کے اتنا کانچ توڑ دیا۔" وہ غصے کے عالم میں بڑبڑا رہی تھیں۔ جب ان کے قریب آکر سمیر نے بے حد سنجیدگی بھرے غصے سے کہا تھا۔

"آپ کو ان کانچ کے ٹکڑوں کی پرواہ ہے۔ جو فرش پہ گرے اور ٹوٹ گئے۔ ادھر اتنے قیمتی دل ٹوٹ رہے ہیں۔ ان کی ذرا پرواہ نہیں۔" سمیر اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تھا۔ تیزی سے باہر نکل گیا۔ ساکت کھڑی نائلہ بیٹے کی پشت کو گھورتی رہ گئی تھیں۔ پھر سر جھٹک کر غصے میں چیخیں۔

"ہر کوئی علامہ بننے پر تلا ہے۔ سڑیل، حاسد میرے بچوں کی خوشی برداشت نہیں ہو رہی۔" وہ اگلے کئی گھنٹوں تک ان سب کو باری باری کوستی رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡
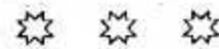
خوب صورت سی تاروں بھری شام آنگن میں اتری تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور تیاری مکمل کرتا مطمئن سا ہو گیا وہ خوشبوؤں میں نہایا بن ٹھن کر نیچے اترا تو امی اداس سی صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ وہ امی کو اداس بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

"جانا نہیں آپ نے؟" ہارون کے پوچھنے پر وہ بے ساختہ چونک گئی تھیں۔

"کہاں جانا ہے؟" وہ غائب دماغی سے بولیں۔

"کمال ہے بھول بھی گئیں؟ آج آپ کے بھتیجے کا نکاح ہے۔ جلدی اٹھیے۔" ہارون خاصا اتاولا ہو رہا تھا۔ امی اسے اتنا بنا ٹھنا بلکہ کسی حد تک دولہا بنا دیکھ کر چونکیں۔

"تم ایسے لشکارے مار رہے ہو۔ جیسے آج تمہارا ولیمہ ہو۔ اتنی تیاریوں کی کیا ضرورت تھی۔" ان کا اپنا دل برا تھا۔ اس لیے برے دل کے ساتھ کہہ رہی تھیں۔ ہارون بے ساختہ چہکا۔

"کیا پتا اپنا بھی کوئی چانس لگ جائے۔" وہ مسکرایا تھا۔ امی نے خفگی سے اسے دیکھا اور پھر اٹھ کر اس کے پیچھے ہی باہر نکل آئیں۔

"کیا ہمیں جانا چاہیے تھا؟" گاڑی میں بیٹھ کر انہوں نے ہارون سے بھرے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں جانا چاہیے؟" ہارون نے الٹا سوال کر دیا۔

"خضر اور ثانی کا دل برا ہو گا۔" وہ جھجکتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"نہیں ہو گا۔" ہارون کا اطمینان قابل دید تھا۔

"میرا تو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہم نہ ہی آتے ہارون۔" امی نے کوئی دسویں مرتبہ کہا تھا۔ ہارون نے اپنا سر ہی پیٹ لیا تھا۔

"اب کیا ہو سکتا ہے ... گھر تو آ گیا ... دیکھیں شامیانے لگے ہوئے ہیں۔" ہارون کھڑکی سے باہر لٹک کر جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ شادی والی گہما گہمی صاف نظر آ رہی تھی۔ مہمان بھی نظر آ رہے تھے۔ اور کام والے لڑکے بھی۔

"میرا دل دھڑک رہا ہے ہارون! ثانی پہ کیا گزرے

گی۔" امی کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔ ہارون نے اپنا ماتھا اسٹیئرنگ سے ٹکرایا۔

"امی! دل کا دھڑکنا تو نارمل بات ہے۔ اگر نہ دھڑکے تو مسئلہ ہو۔ اور باقی ثانی کی فکر چھوڑیں۔" وہ آنکھیں گھما گھما کر باہر دیکھ رہا تھا۔ امی نے اس کے کندھے پہ دھپ لگائی تو وہ بے ساختہ ان کی طرف مڑا۔

"ہارون!" امی نے بڑے دلار سے پکارا تھا۔

"جی جان امی۔" ہارون نے جواباً اسی دلار سے مسکہ لگایا۔

"میری ایک بات مانو گے۔" وہ منت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ہارون ہمہ تن گوش ہوا۔

"اتنے تیار ہو کر آئے ہو۔ اتنے پیارے لگ رہے ہو۔ یہ ویسٹ کوٹ اور کرتا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ بالکل دولہا سے لگ رہے ہو۔ دیکھو ہارون! تمہاری ماں ہو کر منت کر رہی ہوں۔ تمہیں حکم بھی دے سکتی تھی۔ مگر ایسا نہیں کیا۔۔۔ ہارون! میری جان۔"

انہوں نے اس کا کندھا دبوچ کر منہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیا تو ہارون اس شدت کے پیار پہ کراہ بھی نہیں سکا تھا۔ اوپر سے امی کی تمہید اس کی جان نکال رہی تھی۔

"جی۔۔۔ امی۔۔۔ جان!" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا تھا۔

"میرا دل چاہ رہا ہے۔ جس طرح ضمیر اور نائلہ نے کیا۔ ہماری بچی کی عزت نفس پارہ پارہ کر کے۔ آج ہم بھی ان کے منہ پہ جوتا ماردیں۔ انہیں جتلادیں کہ ثانی بھی گری پڑی نہیں۔ ہارون! تم ثانی سے نکاح کے لیے مان جاؤ۔" امی کے الفاظ پہ ہارون اچھل کر کھڑکی سے جا ٹکرایا تھا۔ اس کا حلق خشک ہوگیا اور سانس پھول گئی تھی۔ حالت قلب نازک تھی۔

"امی۔۔۔ یہ ممکن ہی نہیں، کسی بھی قیمت پہ نہیں ۔۔۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔"

وہ امی کے کان پہ جھکا تو اگلے چند منٹوں بعد امی کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ سانس پھول گئی تھی۔ آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔ حالت قلب نازک تھی۔

"یہ کیسے ہوگا؟" امی نے بمشکل اٹک اٹک کر پوچھا تھا۔ تب ہارون نے سینہ تان کر کہا۔

"ایسے۔۔۔" اس نے چٹکی بجائی اور۔۔۔ اتر گیا۔ امی اسے گھورتی رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اور پھر وہ ہوا۔ جو کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ جہاں کسی کی سوچ کی رسائی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہاں پہ ایک چیز کھڑی تھی۔ جسے تقدیر کہا جاتا ہے۔

لیکن اس شام ہوا کیا تھا؟

جب مہمانوں سے گھر بھرا پڑا تھا۔ ڈھولک کی تھاپ گونجتی تھی۔ اور سکھیاں ملن کے گیت گاتی تھیں۔ نائلہ خوش بھی تھیں اور آزردہ بھی۔ یہ آزردگی جانے کیوں دل میں چٹکیاں بھر رہی تھی۔ یہ ایک وسوسہ تھا جس پہ توجہ دی جاتی تو نائلہ پوری جان سے کانپ جاتیں۔ کیونکہ یہ وسوسہ بے بنیاد نہیں تھا۔

اور وہ اپنے چٹکیاں بھرتے دل کو جھوٹے دلاسے دیتی کاموں کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ اس دوران ان کی زیب پہ بھی نگاہ پڑی تھی۔ وہ نکاح کے لیے تیار ہو کر آگیا تھا اور بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ یوں کہ نائلہ نے کتنی ہی مرتبہ چپکے چپکے نظر اتاری تھی۔

افزا بھی تیار تھی۔ اب بس نکاح ہونا تھا۔ نائلہ کو اس وقت کا کتنی بے چینی سے انتظار تھا۔ اور اب یہ مبارک گھڑی آن پہنچی تھی۔

لیکن نکاح سے کچھ دیر پہلے ہی وہیل چیئر گھسیٹتے ضمیر اپنی کچھار سے باہر آگئے تھے۔ ان کا لباس مسلا ہوا تھا۔ اور آنکھیں ویران تھیں۔ نائلہ کے ماتھے پہ بل آگئے تھے۔ ایک تو زیب کی ضد؟ اس شخص کے بغیر بھی تو نکاح ہو سکتا تھا؟

وہ بل کھاتی شوہر کو گھورنے لگیں۔ معاً ان کی کسی بھانجی نے آواز لگائی تھی۔

"خالہ! آپ کو افزا بلا رہی ہے۔" وہ اس پکار پہ کیا دھیان دیتیں انہیں اچانک ضمیر نے روک لیا تھا۔ وہ

ماتھے پہ بل ڈالے رک گئی تھیں۔

"جو تم نے کیا... اچھا نہیں کیا۔ میرے بیٹے کو اس کی محبت سے بدگمان کیا اور اس الو کے پٹھے کی محبت بھی ایسی ہی تھی جو پل میں بدگمان ہو گیا۔ پھر بھی میں، سب کچھ بھلاتا ہوں کہ افزا کو بیٹی کہا ہی نہیں سمجھا بھی تھا۔ اور اگر وہ ثانی کی جگہ نہ ہوتی تو خود اسے رخصت بھی کرتا۔ لیکن خیر... اب کیا کہوں، مجھے آج احساس ہوا ہے کہ مدحت کیا تھی؟ اور تم کیا ہو؟ بس اتنا کہوں گا کہ چالیں الٹی بھی ہو جاتی ہیں۔ اور تدبیریں تقدیر سے ٹکرا بھی جاتی ہیں۔ بہر حال بیٹی کی شادی کر رہی ہو۔ سو مبارک باد کی حق دار ہو۔ اور اس لحاظ سے خوش قسمت بھی کہ مدحت کے بیٹے نے تمہیں اسی مقام پہ جگہ دی جس پہ اس کی ماں تھی... یا اس کی ماں ہوتی۔" وہ اپنی بات کہہ کر وہیل چیئر سمیت زیب کے کمرے کی طرف مڑ گئے تھے۔ اس حالت میں کہ نائلہ پتھر کا بت بن گئی تھیں۔ پھر کسی نے ان کا کندھا ہلایا تھا۔

"حافظ صاحب کب سے انتظار کر رہے ہیں۔ دلہن سے اجازت لینی ہے۔ آپ کہاں گم ہیں۔"

"آں... ہاں ادھر کمرے میں چلو، میں ساتھ آتی ہوں۔" نائلہ گڑبڑا کر آگے بڑھنے لگی تھیں۔ جب اچانک ہارون ان کے سامنے آ گیا تھا۔

"دلہن کمرے میں نہیں ہے۔ چھت کے اوپر ہے اور ابھی تک پیلے جوڑے میں ملبوس ہے وہ تیار نہیں ہوئی۔ ادھر ٹنکی کے پاس دیکھا ہے میں نے... شامیانے سے نکلتے ہوئے اچانک اوپر نگاہ پڑ گئی تھی۔ اسی لیے بھاگا بھاگا آیا ہوں۔ کہیں خودکشی تو نہیں کرنے لگی؟" ہارون کے الفاظ پہ نائلہ کی روح تک کانپ گئی تھی۔ انہوں نے شدید غصے کے عالم میں ہارون کو گھورا۔

"تمہارے منہ میں خاک۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی تھیں۔ ہارون انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ پھر سکون سے تخت پہ بیٹھ گیا۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ لی تھی۔ اور سامنے رکھی مٹھائی کی ٹوکری سے مٹھائی نکال نکال کر کھا رہا تھا۔

"میرے منہ میں خاک کیوں خدانخواستہ... میرے منہ میں چم چم، قلاقند۔" وہ مٹھائی پہ ہاتھ صاف کرتا رہا۔ اور اوپر ہونے والی کارروائی کے متعلق سوچتا رہا... وہ چشم تصور سے دیکھ سکتا تھا۔

افزا کا اجڑا روپ، ویران آنکھیں، اداس چہرہ۔ لٹا پٹا سراپا۔

"کوئی بات نہیں جان! بس چند ساعتوں کی بات ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔ پھر رس گلے کھاتا رہا۔ اور اوپر کے منظر کو چشم تصور سے دیکھتا رہا۔ اسے اندازہ تھا۔ اوپر کیا چل رہا ہو گا۔

نائلہ جب لرزتے قدموں سے چلتی ہوئی اوپر آئیں تو افزا کی حالت کسی کٹی پتنگ جیسی تھی۔

ان کی آنکھیں افزا کو دیکھ رہی تھیں۔ اور کان ڈھولک کی تھاپ سن رہے تھے۔

رات کی تاریکی میں ڈھولک کی تھاپ مجیروں سے مشابہ تھی۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے چاندی کے تھال میں سکے گر رہے ہوں۔ ایسا شور جو ساعتوں کو بھلا لگنے کے بجائے گراں گزر رہا تھا۔ بلکہ نیچے سے آتی ہر آواز۔

اس کی گوری کلائیوں میں سجی چوڑیاں بھی کھنک سے خالی تھیں۔ اور اس کے وجود سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ نائلہ کے دل پہ جیسے تلواریں چل گئی تھیں۔

افزا کی حالت کہیں سے بھی دلہن نہیں لگ رہی تھی۔ وہ تو کوئی اجڑی ہوئی سودائی لگ رہی تھی۔ نائلہ نے اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔

"یہاں کیا کر رہی ہو؟ میں نے تمہیں تیار ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ اب چلو نیچے۔ نکاح کے لیے حافظ صاحب بھی پہنچ گئے ہیں۔" وہ اسے بازو سے دبوچ کر نیچے لے جانا چاہتی تھیں۔ جب افزا نے ان سے ایک عجیب بات کہی تھی۔

وہ انہیں کٹہرے میں کھڑا نہیں کر رہی تھی۔ وہ ان سے جھگڑا بھی نہیں کر رہی تھی۔ وہ تو صرف انہیں احساس دلا رہی تھی۔ اور اس کے لفظ؟ ان کا رواں

رواں کان بن گیا تھا۔

"اگر آپ کو ان سے محبت ہے تو؟ اگر آپ کو اپنی بیٹی سے محبت ہے تو یوں مت کریں۔ ایسا مت کریں۔"

چار لفظوں کے اس چابک کو اگر جملہ کہتے تھے تو یہ جملہ بڑا سخت قسم کا تھا۔ ان کی ہستی کو ہلا دینے والا۔

"یہ دیا ہے... آپ نے ان کی محبت کا انعام؟ دھوکا دہی؟ بدگمانی' ایک چال میں لپٹا رشتہ؟ یہ احسان مانا تھا آپ نے اپنے شوہر کا؟ جس نے کسی اور کی اولاد کو عمر بھر اپنے گھر میں رکھا۔ پالا پوسا' تعلیم دی اور آپ نے اس کا بیٹا تک اس سے چھین لیا؟ اس شخص کا اپنی اولاد پہ اتنا بھی حق نہیں تھا؟ کہ وہ اپنی مرضی کا کوئی فیصلہ اس سے منوا لیتا؟ آپ نے بیچ میں اپنی محبت رکھ دی؟ کیا ہے آپ کی محبت؟ دھوکے میں لپٹی؟ غرض میں لپٹی؟ مطلب میں لپٹی؟ وہ آپ کی بیٹی کو بس اپنا لے؟ آپ کی بیٹی ایک بڑے افسر کی بیوی بن جائے۔ بس اتنی سی خواہش ہے آپ کی؟ اور بدلے میں وہ خود کہیں کھو جائے... یہ تھی آپ کی زیب سے محبت؟ بس اتنی سی؟ ایک دن بھی آپ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر نہیں دیکھا؟ کیا وہ خوش ہے اس زبردستی کے رشتے پہ؟ آپ ماں ہوتیں یا آپ کو اس سے محبت ہوتی تو اس کے دل اور آنکھوں کی ویرانی آپ کو نظر آ جاتی۔ کیا وہ آپ کو چیخ چیخ کر بتاتا؟ وہ خوش نہیں ہے۔ اس کا دل برباد ہو گیا ہے۔ آپ نے اسے ثانی سے بدگمان نہیں کیا بلکہ اس کا اعتبار توڑا ہے۔ اس کے اعتماد کو ہلایا ہے۔ آپ کو لگتا ہے۔ زندگی کے کسی موڑ پہ اسے پتا چلا تو وہ مجھ پہ بھی اعتبار کر پائے گا؟ اور محبت؟ یہ تو آپ نے سوچا بھی نہیں ہو گا؟ وہ مجھے محبت دے گا یا نہیں... اس کے لیے نہ سہی اپنی بیٹی کے لیے تو سوچتیں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی بولتی جا رہی تھی۔ اور نائلہ؟ ان کی حالت ایسی تھی جیسے جسم میں جان ہی باقی نہ ہو یہ کیسا آئینہ تھا۔ جوان کی بیٹی نے انہیں دکھا دیا تھا اور اس آئینے میں ان کا کریہہ روپ نظر آ رہا تھا۔ ان کی بھیانک صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ شدید اذیت میں مبتلا تھیں۔ جبکہ افزا ان سے کسی بھی بات کی وضاحت لیے بغیر تیزی سے نیچے جا رہی تھی۔ کہاں؟ کس طرف؟ نائلہ کو اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ اگر اندازہ ہوتا۔ تو افزا کو روک لیتیں۔ اسے واسطے دے کر منا لیتیں۔ مگر نیچے نہ جانے دیتیں۔

وہ شکستہ قدموں سے شاہ زیب کے کمرے سے نکلیں تو ایک مرتبہ پھر ہارون نے انہیں روک لیا تھا۔

"آپ نے اچھا کیا زیب کو افزا کے انکار کا بتا دیا۔ میں بتاتا تو برا لگتا اس کو خیر' خبر خوشی کی ہے یا غمی کی۔ یہ تو اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ آپ غم میں ہیں اور میں خوشی... مطلب خوشی کو غارت ہوتا دیکھ کر پریشان ہوں۔ اس تقریب کی سوگواری کو دور کرنے کے لیے آپ کی بیٹی چھوٹے ماموں کو ساتھ لے کر مطلب وہیل چیئر سمیت نیچے چلی گئی ہے۔ خضر ماموں کے پاس۔ اب نیچے کیا ہو رہا ہے مجھے نہیں پتا آپ کو اطلاع دینے کے لیے رکا ہوا تھا۔ اب نیچے جا رہا ہوں۔ شاہ زیب سے ملاقات پھر سہی... اور ہاں' اب بتائیے گا مجھے۔ میرے منہ میں خاک یا شکر؟" وہ ایک تواتر سے بولتا نائلہ کو بم کی طرح لگا تھا۔ جو گاہے بگاہے ان کے سر پہ پھٹ پڑتا تھا۔

نائلہ اس کی تقریر پہ چیخ پڑی تھیں۔ ان کا بی پی شوٹ کر رہا تھا۔ یہ آخر کیا ہو رہا تھا؟

"تمہارے منہ میں خاک۔"

وہ بل کھاتی ہوئی پیچھے مڑیں تو شاہ زیب کو سمیر' رمیز' حسن' احسن گھسیٹ کر کہیں لے جا رہے تھے۔ جب وہ منظر سے ہٹے تو نائلہ کے پیروں میں پہیے لگ گئے تھے۔ وہ شاہ زیب کو روکنا چاہتی تھیں۔ لیکن بے سود اور ادھر ہارون ان کے تاثرات سے مزہ لیتا لب کشائی کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

"اب آپ کو نئی اطلاع بھی دے دیتا ہوں۔ کیا یاد کریں گی آپ۔ زیب کو آپ کے لخت جگر بر غمال بنا کر نیچے لے گئے ہیں۔ بڑے ماموں سے معافی دلوانے اور ان سے یہ کہنے کہ آپ کے بیٹے جانی کو اپنی فرزندی میں لے لیں۔" ہارون ایک مرتبہ پھر ان کے سر پہ کسی

بم کی طرح پھٹ پڑا تھا۔ اب کے ان کی ساری ہمت نچڑ گئی تھی۔ وہ جیسے شکست خوردہ ہو کر ڈھے گئیں۔ اب کوئی کوشش بھی بے کار تھی۔ بے سود' بے فائدہ.... ان کی چال اپنی کشتی سمیت ڈوب گئی تھی۔

اور ان کی بیٹی نے سچ ہی کہا تھا.... انہوں نے شاہ زیب کو نہیں خود کو دھوکا دیا تھا۔ زیب کو ثانی سے متنفر کر کے دور کیا۔ اور اپنی بیٹی کے لیے راہیں ہموار کیں۔ یوں اپنے شوہر کی بھی مجرم بنیں۔ بیٹے کی بھی۔ اور جس پہ الزام دھرا تھا اس کی بھی۔ اور ان کے ہاتھ کیا آیا؟ ندامت' پچھتاوا؟

ان کی فریب کاری ان کے منہ پر پڑی تھی۔ ایک جوتے کی مانند۔

اور اب وہ ہاتھ ملتی شدید ندامت کے گڑھے میں اوندھی گری پڑی تھیں۔ تنہا اور اکیلی.... اوپر خاموشی تھی' نیچے ہنگامہ تھا۔ پہلے اوپر ہنگامہ تھا اور نیچے موت کی سی خاموشی۔ اور یہ تقدیر کے ہی کھیل تھے۔ جب چاہتی نصیب پلٹ جاتے۔ بازیاں الٹ جاتیں۔

وہ نم آنکھوں کو مسلتی اس اندھیرے لاؤنج میں تنہا بیٹھی تھیں۔ اور یہ ان کے عمل کا رد عمل تھا۔ تنہائی' اکیلا پن اور سناٹا انہوں نے اپنے گھر کی خوشیوں کو خود آگ لگائی تھی۔ اس پہ جتنے آنسو بہاتیں کم تھا۔

☆ ☆ ☆

اور یہ ایک تقریب باسعید کا منظر تھا۔

تاروں بھری شام جو رات میں ڈھل گئی تھی اس وقت بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ہنستے مسکراتے چہرے اور رونقیں۔ ان چہروں پہ حقیقی خوشی اور رونق تھی۔ اور یہ رونق ایسے نہیں لوٹی تھی۔ اس کے لیے بڑی پلاننگ کرنا پڑی تھی۔

اس پلاننگ کا ماسٹر مائنڈ ایک عام سا دماغ تھا۔ جو نہ تو پڑھائی میں چل سکا تھا۔ اور نہ ہی کاروبار میں.... ہاں' رشتے بنانے اور نباہنے میں اس کا دماغ خوب چلتا تھا۔ اور جس کے کمال نے آج اس تقریب کو بھی بام کمال پہ پہنچا دیا تھا۔

جی ہاں۔ یہ ہارون تھا.... باتوں کا جادوگر اور لوگوں کو شیشے میں اتار لینے والا۔ سو اس نے سب سے پہلے افزا کو شیشے میں اتارا تھا۔ افزا بھلا اسے کہاں ملی تھی؟ کہیں بھی نہیں.... ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی؟ پھر کیا ہوا تھا؟ بہت سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہارون نے بس ایک فون کال سے کام چلایا تھا۔ چھوٹی سی ایک کال۔ اتنا بڑا "بھونچال" لے آئی تھی۔ یہ بھونچال نہیں تو اور کیا تھا؟ شادی رکی اور پھر چل پڑی۔

اس کے لیے چند گھنٹے پیچھے جانا پڑا تھا۔

جب ہارون گھر سے تیار شیار ہو کر آیا تھا۔ تب وہ پوری پلاننگ کے ساتھ آیا تھا۔ جب ماموں کے گھر پہنچا تو امی کی اچانک امڈ آنے والی ہمدردی اس کی پلاننگ پہ لات مارنے والی تھی۔ لیکن اچھا ہوا۔ امی کو اس کی پلاننگ پسند آ گئی تھی۔ تب ہارون نے سمیر سے کہا کہ بلکہ اسے اعتماد میں لے کر افزا تک پیغام پہنچایا۔ یوں افزا ہارون سے فون پہ بات کرنے کے لیے رضامند ہو گئی تھی۔ اور اس بات کا متن کیا تھا؟ انتہائی مختصر۔ ہارون نے کوئی لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھی تھی۔ اس نے صاف اور سیدھی بات کی۔ مستحکم اور دوٹوک۔ جسے سن کر افزا کی روح تک کانپ گئی تھی۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

"سنو' افزا! میں لمبی بات نہیں کروں گا۔ بس اتنا سن لو۔ تمہاری والدہ نے جو منصوبہ سازی کی ہے' وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو گی۔ شاہ زیب وقتی طور پہ بدگمان ہوا ہے اور ان کی باتوں میں آ گیا ہے۔ لیکن کب تک؟ ثانی پہ الزام لگایا گیا ہے۔ بات اس کے کردار کی ہے۔ اور نام میرا بھی بیچ میں آ رہا ہے۔ میں چپ نہیں رہوں گا۔ بلکہ زیب کو خانہ کعبہ لے جا کر اپنی اور ثانی کی صفائی دوں گا۔ وہ میری بہن ہے۔ اور قیامت تک بہن ہی رہے گی۔ اس کے بعد ہر صفائی ہیچ ہے۔ باقی' تمہاری والدہ نے جو کھیل رچایا ہے؟ کیا وہ کامیاب ہو سکے گا؟ کیا تم جانتی ہو کسی کی زندگی میں زبردستی گھسنا کیا ہوتا ہے؟ تم زیب کی زندگی میں تو آ جاؤ گی۔ مگر اس کے دل میں جگہ نہیں پا سکو گی۔

کیونکہ ایک بات تو طے ہے۔ زیب 'ثانی سے اور ثانی' زیب سے محبت کرتی ہے۔ زیب اعتراف کرے نہ کرے۔ محبت تو ایک حقیقت ہے تو کیا بہتر نہیں.... کسی ایسے شخص کی زندگی میں شامل ہونے سے گریز کیا جائے جو آپ کا ہے ہی نہیں۔ بلکہ کسی ایسے بندے کو منتخب کرلیا جائے جو آپ کو چاہتا ہو.... جیسے کہ میں.... تمہارے پاس دس سیکنڈ ہیں۔ فیصلہ کرو اور مجھے آگاہ کردو۔ باقی مجھ پہ چھوڑ دینا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

اور ہارون کو اپنی تقریر کا دس سیکنڈ میں نہیں آدھے سیکنڈ میں جواب مل گیا تھا۔ صرف آدھے سیکنڈ میں۔

"آپ نے جو کہا۔ میں نے سن لیا۔ فیصلہ کٹھن ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ مجھے آپ کا تعاون درکار رہے گا۔" افزا کی آواز اس کے لیے ہفت اقلیم کی دولت کا پیغام تھی۔ اس نے کال بند کردی تھی۔ اور اب انتظار کررہا تھا۔ پھر یہ انتظار اتنا طویل نہ رہا۔ ایک دم پورے ڈرامے کا سیٹ ہی بدل گیا تھا۔

افزا نے ماں سے دو ٹوک بات کی اور پھر ایک بڑا اور انہونا فیصلہ کرتی نیچے چلی آئی تھی۔ اگر اوپر اس کی ماں نے معاملات خراب کیے تھے تو نیچے والوں پہ ان کا اثر لازمی تھا۔ اب ضروری تھا کہ نیچے بھی ساری بے ترتیب چیزوں کو درست کیا جاتا۔ اور اس کے لیے افزا نے بڑا بہادری کا کام کیا تھا۔ وہ نیچے تایا ابو کے پاس آگئی تھی۔ اور پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر تایا ابو کے سامنے دوزانو بیٹھ کے ان سے معافی مانگی۔ تایا ابو تو اس افتاد پہ گھبرا اٹھے تھے۔ انہوں تو یہ سوچا بھی نہیں تھا۔ جو ہو رہا تھا اور جو ہونے جا رہا تھا۔ یہ ایک فلمی سی سچویشن تھی۔ جس کا ڈائریکٹر ہارون تھا۔ جو اب دروازے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جبکہ افزا لگاتار روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں آپ سے اور ثانی سے معافی مانگنے کے لیے آئی ہوں۔ جو کچھ میری امی نے کیا۔ جو ثانی پہ الزام لگایا۔ جسے سن کر زیب کو غصہ آیا۔ اور ان کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اس سب میں زیب کا کوئی قصور نہیں۔ پلیز' تایا ابو! ہمیں معاف کردیں۔ اور ہو سکے تو میری امی کو بھی.... اور زیب کو اپنا بیٹا بنالیں۔ مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔ کیونکہ مجھے احساس ہو گیا ہے۔ کچھ غلط ہوتا دیکھ کر اس پہ آنکھیں بند کرلینا بھی گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔"

وہ بولتی جا رہی تھی۔ اور روتی جا رہی تھی۔ اس کے آنسو ساری بدگمانی کو دھو رہے تھے۔ سب کے دل صاف ہو رہے تھے۔ ان کا دل پسیج گیا اور ان کی بیٹی کا بھی۔ ڈیڈی نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ تب ہی ضمیر بھی آگے بڑھ آئے۔ انہوں نے بھی بھائی کی طرف ہاتھ بڑھا دیے تھے۔ جنہیں ڈیڈی نے تھام لیا تھا۔ دلوں کی کدورتیں اور فاصلے ختم ہوگئے تھے۔ تب ہی سمیر اور رمیز زیب کو بھی گھسیٹ لائے۔ اور زیب سب جان چکا تھا۔ اپنی عزت ماب والدہ کی چال بازی کو بھی.... اور وہ سب کچھ درگزر کرسکتا تھا۔ لیکن ثانی پہ لگے الزام کو؟ یہ ایک پھانس تھی۔ جو اس کے سینے میں اٹک گئی تھی۔ امی کچھ بھی کرلیتیں۔ مگر ثانی پر الزام نہ دھرتیں۔ کیا رشتہ توڑنے کے لیے کوئی اور جواز نہیں تھا ان کے پاس؟

اور زیب جب خود آگیا تھا تو ڈیڈی کہاں تک ناراض رہتے۔ اس پہ دو چار گالیوں کی برسات کرکے اسے سینے سے لگالیا تھا۔

ادھر گلے شکوے دور ہو رہے تھے' ادھر حافظ صاحب ناراض ہو کر واپس جا رہے تھے۔ اور گھر میں موجود مہمانوں نے الگ شور مچا رکھا تھا۔ ہارون بھاگم بھاگ حافظ صاحب کو پکڑ لایا تھا۔ مہمان پھر سے اکٹھے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد نکاح ہوا۔ مگر دلہنوں اور دولہا کی تبدیلی کے ساتھ۔

☼ ☼ ☼

اور اب اسٹیج پہ کچھ روشن چہرے موجود تھے۔ اور ان میں ایک چہرہ ساری دنیا سے خفا اور بیزار بھی تھا۔

جی ہاں۔ نشاۃ الثانیہ کا چہرہ۔ خفا اور بیزار۔ اوپر سے الٹا سیدھا میک اپ جو فوری دستیاب کزنز کے اناڑی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماءے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہاتھوں کا کرشمہ تھا۔ درحقیقت اسے میک اپ کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر بھی پھوپھو نے اپنے ارمانوں کے ہاتھوں تنگ آکر اسے کارٹون بنا ہی دیا تھا۔

یہ سب کچھ بہت اچانک ہوا تھا۔ بلکہ ڈرامے کا پورا سیٹ ہی بالکل اچانک تبدیل ہو گیا تھا۔ زیب کی اچانک شادی پہ اس نے رو دھو کر صبر کر ہی لیا تھا۔ وہ اتنی گری پڑی تو نہیں تھی کہ محبت نہ ملتی تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر منتیں کرتی۔ اسے اپنی انا بڑی پیاری تھی۔

البتہ ڈیڈی کے لیے اس شادی کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ اپنی بھڑاس بھی نکالتے تھے۔ غصہ بھی کرتے تھے اور پھر بے بسی کے عالم میں رونے بھی لگتے تھے۔ لیکن ثانی نے خود کو مضبوط کر لیا تھا۔ وہ نہ روئی اور نہ شادیانوں اور ڈھولک کی آواز پہ اپنے ضبط کو بے قابو کر سکی۔ اس نے خود کو ''بے حس'' بنا لیا تھا۔ لیکن یہ بے حسی کئی موقعوں پہ تڑخی بھی تھی۔ خاص طور پہ جب بھی وہ کچن اور کمرے کی جالیوں میں سے زیب کو اوپر، نیچے، اندر، باہر جاتا دیکھتی تھی۔

یہ محبت بھی عجیب بلا تھی۔ اور اس کا جادو بھی عجیب تھا۔ اور نہ کوئی تعویز ردبلا تھا۔

جب سے پھوپھو کی زبانی اسے چاچی کے بہتان کا پتا چلا تھا تب سے تو وہ اندر ہی اندر کٹ رہی تھی۔ مر رہی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کہیں سے زیب کو پکڑ کر اپنے سامنے لے آئے۔ اور چیخ چیخ کر چاچی کے جھوٹ کا بتائے۔ رشتہ توڑنے کے لیے انہوں نے اس پہ اتنا بڑا الزام لگا دیا تھا؟

پھر جب افزا اور زیب کی شادی کا ہنگامہ اٹھا اور پھوپھو کو جلال آیا تو انہوں نے ہارون کے لیے ڈیڈی سے فوراً ''ثانی کو مانگا تھا۔ یہ اچانک رشتہ دراصل چاچی کے منہ پہ طمانچہ مارنے کے مترادف تھا کہ ان کی بھتیجی ایسی گری پڑی نہیں ہے۔ لیکن ثانی نے سہولت سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے لیے دنیا میں کوئی رشتہ نہ بھی بچتا تب بھی ہارون تو کسی طور پہ بھی اس کی زندگی میں نہیں تھا۔ اس کے پیچھے دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ہارون کو ثانی نے ہمیشہ بھائی سمجھا تھا۔ وہ اسے کسی اور رشتے کے تناظر میں دیکھ ہی نہیں سکتی تھی اور دوسرے یوں تو چاچی کو باتیں بنانے کا موقع مل جاتا بلکہ وہ زیب پہ ثابت بھی کر دیتیں۔

''دیکھا ان دونوں کا چکر تو تھا نا۔'' اور ثانی کو یہ کسی بھی قیمت پہ گوارا نہیں تھا۔

پھر جب ثانی نے اندر ہی اندر مٹنے اور پگھلنے کے بعد کسی حد تک حالات سے سمجھوتا کر ہی لیا تھا تب اچانک وہ ہو گیا جو کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ مہمان رخصت ہوئے۔ گھر آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا تھا۔ پھر اچانک ہی باقی رہ جانے والے خاندان کے لوگوں نے رخصتی کا شور مچا دیا تھا۔

جی ہاں، رخصتی؟ افزا اور ہارون کی۔

ان کی زندگیوں میں در آنے والا یہ موڑ بالکل اچانک آیا تھا۔ جیسے ہی ثانی اور زیب کا نکاح ہوا۔ ساتھ ہی ہارون نے پھوپھو کا پلو پکڑ لیا۔

پھوپھو نے ضمیر چاچو سے افزا کا ہاتھ مانگا تو سب کو ہی نائلہ چاچی کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ افزا کے نکاح کا شور بار ندامت سے دبی نائلہ کے لیے ایک زندگی سے بھرپور سندیسہ تھا۔ وہ خود بخود نیچے پہنچ گئی تھیں۔

ان کی گھٹیا چالوں کے باوجود افزا اپنی اچھی نیت کی وجہ سے اچھے لوگوں میں چلی گئی تھی۔ یہ ان کے لیے مقام شکر تھا۔ اور جب اپنی بیٹی کو ہارون کے شور مچانے پہ رخصت کیا تو وہ اندر تک شرمندہ ہو رہی تھیں۔ اور اسی رنجیدگی، ندامت اور شرمندگی تلے دب کر انہوں نے ثانی سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ اس نے چاچی کو معاف کر دیا۔ اور اس معافی کے بعد چاچی نے بھی ڈیڈی سے رخصتی کا مطالبہ کر دیا۔ حالانکہ ثانی ابھی رخصتی کے حق میں نہیں تھی۔ لیکن ڈیڈی نے ایک نہ سنی۔ ویسے بھی بھاوج سے نئی نئی صلح ہوئی تھی۔ وہ دوبارہ سے رنجشیں پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

یوں ثانی بھی ایک ہائی جمپ لے کر نیچے سے اچانک اوپر آگئی تھی۔ اوپر یعنی چاچو کے پورشن میں اور زیب کا کمرہ؟ اور اب جب سارے حواس کام کر

رہے تھے۔ اور اس اچانک بدلتی صورت حال کو ذہنی طور پر قبول کرلیا گیا تھا تب ثانی کو وہ سب کچھ یاد آرہا تھا۔ جسے اس نے کچھ عرصہ پہلے بھلا دیا تھا۔

وہ سارا غصہ، گلے، شکوے جو اسے زیب سے تھے۔ اور ثانی زیب کو فی الحال معاف کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

دوسری طرف زیب کی کیفیات بھی مختلف نہیں تھیں۔

جب امی نے آکر اسے اتنا کہا۔ "وہ شادی کے لیے نہیں مان رہی۔"

یہ الفاظ نہیں تھے۔ اس کے لیے رہائی کا پیغام تھے۔ اور مقام شکر بھی۔ اس پہ بات نہیں آئی تھی۔ اور وہ صاف طور پہ بچ بھی گیا تھا۔

جس حد تک وہ ثانی سے بدگمان تھا۔ امی اس کے لیے کسی کو بھی منتخب کرلیتیں۔ بس وہ نشاۃ الثانیہ نہ ہوتی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ لڑکی جسے اپنے بچپن کے طے شدہ رشتے کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ کیوں اس لڑکی کے لیے اپنے گھر کا ماحول خراب کرتا اور پھر زبردستی ثانی پہ مسلط ہوجاتا۔

اور اب جب ساری غلط فہمیاں دور ہوگئی تھیں تو زیب چاہتا تھا کہ پچھلی ساری باتوں کو بھلا کر نئے سرے سے نئی زندگی کی شروعات کرنی چاہیے تھیں تو۔۔۔ اب کے وہ پھنس بہت برا گیا تھا۔ کیونکہ جو اس کی شریک سفر تھی۔ وہ اتنی آسانی سے کچھ بھی بھلانے والی نہیں تھی۔ لگ رہا تھا۔ وہ ڈیڈی کے مجبور کرنے پہ اوپر آتو گئی تھی مگر ایسے بیٹھی ہوئی تھی جیسے زیب سے دو دو ہاتھ کرنے کے بعد تن فن کرتی نیچے چلی جائے گی۔

اور یہ اس کی بدقسمتی ہی تھی جو اس نے ثانی سے کہہ ہی دیا۔ بلکہ غلط وقت میں کہہ دیا تھا۔

"دیکھو ثانی! جو کچھ بھی ہوا۔ اب اسے بھلانا اور ذہنی طور پہ قبول بھی کرنا ہے۔ بڑوں کے فیصلے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ تم بھی ذہنی طور پہ قبول کرلو۔"

زیب بولتا بولتا اچانک رک گیا تھا۔ شاید اسے احساس ہوا تھا۔ یہ الفاظ نئی نویلی دلہن کے حساب سے

ٹھیک نہیں تھے۔ دلہن بھی وہ جو اچانک آئی تھی۔
اسے احساس ہوا۔ وہ قطعاً ”ان رومانٹک“ بندہ ہے۔
کم از کم اب تو کوئی ڈھنگ کا جملہ بول دیتا۔ بلکہ اپنی
خواہش اور خوشی کا ہی اظہار کر دیتا۔ کہ کیسے اس جیسے
بدھو کی خدا نے سن لی تھی۔ اب بھی اس نے بڑوں
کے کندھے پہ بندوق رکھی تو اندر تک سلگی بیٹھی ثانی
بھڑک اٹھی تھی۔

وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی رہی تو
زیب کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ اس نے واقعی نامناسب
جملہ بولا ہے۔ اسے ثانی کی تعریف ہی کر دینی چاہیے
تھی۔

اب ثانی کی بھلا تعریف کیا کی جاتی؟ زیب نے اس
کا تفصیلاً ”جائزہ لے کر نفی میں سر ہلایا تھا۔ وہ قطعی طور
پہ روایتی دلہن نہیں تھی۔ بلکہ سر جھاڑ منہ پہاڑ.....
خستہ سے کپڑے ’اترا‘ پھیلا میک اپ‘ کھلے بال‘ اس کے
باوجود زیب نے دل پہ پتھر رکھ کر اپنے پہلے جملے کا اثر
مٹانے کی غرض سے کہہ ہی دیا۔

”تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو ثانی!“ اس
آواز اور الفاظ پہ ثانی کو دو سو واٹ کا کرنٹ لگا تھا۔

”آنکھیں ٹھیک ہیں کیا؟ میں تمہیں اس حلیے
میں اچھی لگ رہی ہوں۔ افزا کے انکار کا کچھ زیادہ غم
نہیں لگ گیا۔ بینائی ہی جاتی رہی۔“ اس کا لہجہ گہرا
کاٹ دار طنزیہ تھا۔ زیب نے گہرا سانس خارج کیا۔
یعنی ثانی اپنے اصلی جنگجو رنگ میں ہی تھی۔ اسے تسلی
ہوئی۔

”بیوی ہو تو ہر حلیے میں اچھی ہی لگو گی۔ غم تو
تمہیں لگا ہوا تھا۔ تب ہی جوگیوں جیسی حالت بنا رکھی
ہے۔ میں تو اتنا فریش ہوں اور تمہیں پا کر تو کچھ زیادہ ہی
فریش لگ رہا ہوں۔“ زیب نے مسکرا کر کہا تو اس کو
جیسے آگ ہی لگ گئی تھی۔

”تم کیا سمجھتے ہو۔ افزا کی بہادری کا میڈل اپنے سینے
پہ سجا لو گے؟ اگر افزا انکار نہ کرتی تو میرے سامنے
ہیرو بن کر نہ بیٹھے ہوتے۔ شکر ادا کرو جو افزا کی بہادری
نے تمہیں ڈائیلاگ جھاڑنے کے قابل کر دیا۔“ وہ
جانے کس کس بات کا غصہ اتار رہی تھی۔ اس کی
اتنے سالوں کی لاتعلقی اور بیگانگی کا؟ اپنے ریجیکٹ
کیے جانے کا؟ یا اب کی سچویشن کا؟

”مجھے ڈائیلاگز جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ
کام تو ہارون بہت اچھے سے کر رہا ہو گا۔ افزا کو اپنی محبت
کا یقین دلاتے ہوئے۔ کیونکہ وہ محبت جو ہم دونوں کے
بیچ ہے۔ اس کا یقین ہم دونوں کا ملن ہے۔ ورنہ ایسا
کبھی نہ ہوتا۔“

وہ اب بہت بدلے لہجے اور انداز میں کہہ رہا تھا۔
اس کی نرم گرم جذبے لٹاتی نگاہیں اور الفاظ؟ ثانی کا
دل ہاتھوں سے بس نکلنے ہی لگا۔ اس نے بمشکل نگاہ
چرائی تھی۔

”لیکن اگر افزا یہ قدم نہ اٹھاتی؟ تب تمہاری محبت
اور یقین کہاں جاتا؟ اب بھی جو کیا افزا نے کیا۔ تمہیں
تو افزا ابھی قبول تھی۔“ اصل پھانس تو یہی تھی۔ جو نکل
نہیں رہی تھی۔ زیب سمجھ گیا تھا۔ اسی لیے اسے نرمی
سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

”تم کیسے کہہ سکتی ہو جو کچھ بھی کیا۔ افزا نے کیا؟“
وہ ملائمت سے پوچھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ چھویا ہوا۔ نرمی
سے دباتا ہوا۔ وہ اپنے دھیان میں نہیں تھی۔ ورنہ
ہاتھ ہی کھینچ لیتی۔

”تو کیا میں اندھی ہوں۔“ وہ برا مان گئی تھی۔

”ہرگز نہیں۔“ زیب نے نفی میں سر ہلایا ”لیکن
تمہارا اندازہ غلط ہے ثانی! چلو میں تمہیں بتاتا ہوں۔
جب امی نے کہا۔ ثانی اور ہارون خدانخواستہ ایک
دوسرے کو چاہتے ہیں۔ تو مجھے فطری طور پہ بہت غصہ
آیا۔ بہت حسد ہوا۔ دل چاہا دو جھانپڑ لگا کر تم سے نکاح
پڑھوا لوں۔ پھر عقل سے کام لیا تو سوچا کہ زور زبردستی
کے رشتے پائیدار نہیں ہوتے۔ تب میں امی کی
آنکھوں سے دیکھتا اور ان کے کانوں سے سن رہا تھا۔
لیکن نکاح سے کچھ دیر پہلے حقیقت کھل ہی گئی۔ جب
امی اپنی کسی بہن سے فون پہ بات کر رہی تھیں۔ تب
میں نے سب سن لیا تھا۔ وہ سب کچھ جو بعد میں کھلتا تو
بڑا ہی نقصان ہوتا۔ امی کا بھی اور افزا کا بھی۔ پھر مجھے

سوچنا پڑا کہ کیا کروں؟ کس طرح سے اس شادی کو روکوں؟ اسے تم میری کمزوری سمجھ لو کہ میں نے ساری عمر جنہیں ماں سمجھا تھا۔ ان کے سامنے عین وقت پر انکار نہیں کر سکتا تھا۔

ذہن میں ہارون کا خیال آیا تھا۔ امی کی باتیں سن کر میں جان چکا تھا کہ ہارون پر بھی الزام لگایا گیا ہے۔ میں نے اسے کال کر کے اپنا منصوبہ بتایا۔ وہ نہ صرف سمجھ گیا۔ بلکہ پرجوش ہو گیا۔ بعد میں اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ یعنی افزا سے شادی نہ کرنے پہ۔ ہارون نے افزا کو فون پہ ساری حقیقت بتائی تھی اور سمجھایا بھی۔ خدا کا شکر ہے۔ وہ سمجھ گئی۔ اس نے اپنے دل اور مستقبل کا نہیں سوچا۔ اس نے انسانیت کا سوچا۔ اور سچائی کا ساتھ دیا جس کے انعام میں اسے ہارون جیسا اچھا' چاہنے والا شریک سفر مل گیا۔ میں نے تمہارے لیے غلط سوچا۔ پھر تم سے وضاحت بھی نہیں لی۔ میں اس کے لیے تم سے معافی مانگنے کے لیے بھی تیار ہوں۔"

زیب نے اس کے دونوں کانوں کو چھوا تو ثانی جو ہکا بکا بیٹھی تھی۔ ایک دم چیخ پڑی۔

"یعنی ہارون بھی...؟ افزا، تم اور ہارون..... تم تینوں کو خبر تھی۔ اور مجھ سے چھپایا۔ بلکہ مجھے تڑپایا۔ سلگایا۔ اور اب معافی مانگتے ہو۔ اب اتنا ہی تڑپو اور سلگو۔" ثانی لال بھبوکا سی اچھل ہی پڑی تھی۔

"اس ہارون کی تو میں چٹنی بنا دوں گی۔ کس قدر گھنا ہے۔ بھاپ تک نہیں نکالی۔" وہ غصے میں تاؤ کھا رہی تھی۔

"اس کی چٹنی بناؤ یا قیمہ۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن مجھے تو معافی کا سندیسہ دو۔ تاکہ میری بھی شادی بلکہ ایمرجنسی شادی کی رات تھوڑی رومانٹک ہو سکے۔"

اب وہ پھیلتا ہوا ثانی کے قریب ہوا تو وہ اچھل کر اس سے دور ہٹی تھی۔ ہاں اندر کہیں بدگمانی کے بادل چھٹ رہے تھے۔ لیکن ابھی اسے کچھ اور سزا دینی تھی۔

تاروں بھرا آسمان ہارون کے گھر میں پھیلا مسکرا رہا تھا۔ وہ گھر جہاں افزا گئی تھی۔ وہ گھر جس میں ہارون کی ڈھیروں محبتیں اور چاہتیں تھیں۔ ان چاہتوں میں کھو کر وہ شاہ زیب کو بھلا سکتی تھی۔ اس چاہت کے رنگ ہارون کی محبت کے گہرے رنگوں میں ڈوب کر ملکے ہو سکتے تھے۔ یہ افزا کو یقین تھا۔ اور اس کا یقین باطل نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اور ویسا ہی آسمان کیپٹن خضر حیات کے بنگلہ کے اوپر بھی جھانک رہا تھا۔ اس آسمان پہ اداسی کا رنگ تھا۔ اس آسمان کے نیچے نائلہ کھڑی تھیں۔ رنجیدہ اور پشیمان سی۔

افزا نے ان سے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ "اگر آپ کو زیب سے محبت ہے تو اس کی ویران آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں۔ وہاں آپ کی افزا کا نشان بھی نہیں ہے۔ اگر آپ کو شاہ زیب سے محبت ہے تو زیب کی محبت اسے لوٹا دیں۔"

افزا کے الفاظ نہیں تھے۔ ایک آئینہ تھا۔ جس میں نائلہ کو اپنی کریہہ صورت دکھائی دے گئی تھی۔ سو انہوں نے اپنے دل کو فوراً" ہی پلٹ دیا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کے دل کو ویران کر دیا اور شاہ زیب کے دل کو آباد کر دیا۔ محبت قربانی مانگتی ہے اور ایثار تو ہر صورت۔ سو انہوں نے اپنی بیٹی کا دل قربان کر دیا اور شاہ زیب کی محبت کو بچا لیا۔ وہ لاکھ بری سہی' بدنیت سہی۔ لیکن آزمائش محبت کے اس پیمانے پہ پورا اتر گئی تھیں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	ڈولی
میک اپ	سلیک بائی عینی
فوٹوگرافی	ایم۔ کاشف